اس شمارے میں

حرف اوّل

ازربا آخر چہ می زاید؟ فتن!	حافظ عاطف وحید	2

مطالعۂ قرآن حکیم

تعارف قرآن (۲)	ڈاکٹر اسرار احمد	5

فہم القرآن

ترجمہ قرآن مجید' مع صرفی ونحوی تشریح	لطف الرحمٰن خان	19

نباتات قرآن

زقّوم	سید قاسم محمود	29

حکمت نبویؐ

نیک مقاصد کے لئے دولت کی طلب	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	34

اسلامی معاشرت

اسلام اور انسانی حقوق	سید جلال الدین عمری	39

توضیح و تنقیح

سنت کی تشریعی حیثیت اور سزائے رجم	ڈاکٹر محمود الحسن عارف	51

2/8/05

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرۃ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

مدیرِ اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد

مدیرِ منتظم: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: حافظ خالد محمود خضر

ادارہ تحریر:

حافظ عاطف وحید

پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

جلد ۲۴ | ذوالحجہ ۱۴۲۵ھ ۔ فروری ۲۰۰۵ء | شمارہ ۲

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴۔ فون: ۵۸۶۹۵۰۱

ویب سائٹ: www.tanzeem.org

سالانہ زرِ تعاون: 100 روپے، فی شمارہ: 10 روپے

ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ: 700 روپے امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ: 900 روپے

حرفِ اوّل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!

اسلام کے بارے میں یہ بات بلا جھجک اور بغیر کسی تکلف کے کہی جا سکتی ہے کہ اس کی تعلیمات انسانی زندگی کے ہر گوشے پر محیط ہیں۔ اسی طرح اس معاملے میں بھی کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہمہ گیر اکائی ہے۔ یعنی اسلام کے ایمانی اور اعتقادی امور کا انفرادی و اجتماعی اعمال و افعال سے ایسا ہی تعلق ہے جیسا انسانی جسم کا جان اور روح سے ہے۔ اسی طرح کا معاملہ انفرادی اور اجتماعی معاملات اور اجتماعیت کے مختلف گوشوں کا آپس میں بھی ہے۔ معاشی امور کے ضمن میں جو احکام دیئے گئے ہیں ان کا ایمانیات سے تعلق تو ہے ہی' سماجی و معاشرتی مقاصد سے بھی گہرا ربط و تعلق ہے۔ ربا یعنی سود اس کی بہترین مثال ہے۔ بظاہر یہ ایک معاشی لین دین کا معاملہ ہے' لیکن اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو اعتقادی سطح پر یہ اللہ پر ایمان و توکل کا براہِ راست ناقض ہے۔ انسانی جان کی تیرگی اور قلب و روح کی قساوت کی علامت ہے..... ''از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ!'' اور بین الانسانی معاشرتی اقدار کے لئے مہیب عفریت کی مانند ہے..... ''آدمی درندہ بے دندان و چنگ!'' شاید اسی بنا پر فرمایا ہے نبی آخر الزماں ﷺ نے کہ جس قوم میں (اللہ پر ایمان کے دعوے کے باوجود) ربا کے معاملات غلبہ پالیں' اُس قوم کو غربت و افلاس کے عذاب میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ حدیث میں بیان کردہ اس وعید کو جان لینے کے بعد اس حقیقت کو سمجھ لینا چنداں مشکل نہیں رہتا کہ ہمارے ملک میں مبینہ طور پر بیرونی سطح پر کشکول شکنی کے باوجود' اور زرِ مبادلہ کے ذخائر میں ''ریکارڈ'' اضافے کے علی الرغم غربت میں روز افزوں اضافے اور عام آدمی کی معاشی پریشانیوں میں ''آف دی ریکارڈ'' ترقی کا اصل سبب کیا ہے۔

متذکرہ بالا حقیقت کے پیشِ نظر کس قدر قابلِ افسوس بات ہے کہ آج ستاون برس گذرنے کے بعد بھی صورت حال یہ ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کیا جانے والا ملک' اسلامی جمہوریہ پاکستان' اس اُمّ الخبائث یعنی سود کے حوالے سے اُسی مقام پر کھڑا ہے جہاں ستاون برس پہلے تھا..... بلکہ بعض حوالوں سے ترقی معکوس کا شکار ہے۔ قائداعظم نے ۱۹۴۸ء میں سٹیٹ بنک کی عمارت کے افتتاح کے موقع پر واشگاف الفاظ میں وہ حقیقت بیان کر دی تھی جو مذکورہ بالا

حدیث میں رسالت مآب ﷺ نے چودہ سو سال پہلے منکشف کی تھی۔ قائداعظم نے فرمایا تھا کہ مغرب کے سود پر مبنی معاشی نظام نے انسانیت کو سوائے پسماندگی اور محرومی کے کچھ نہیں دیا۔ انسانی مسائل کم ہونے کے بجائے زیادہ سے زیادہ کی جانب گامزن ہیں۔ اپنی اسی تاریخی تقریر میں قائداعظمؒ نے ماہرین معاشیات کو اسلامی اصولوں پر مبنی نظام وضع کرنے کا ٹاسک دیا تھا' تاکہ ایک حقیقی فلاحی اسلامی ریاست کے تقاضے پورے کئے جاسکیں۔

گذشتہ ستاون برس کے دوران معیشت کو سود سے پاک کرنے کے ضمن میں کئی کوششیں بھی ہوئی ہیں۔ صرف چند کا اشارۃً ذکر مفید رہے گا۔ ۱۹۶۹ء میں اسلامی آئیڈیالوجی کونسل نے فیصلہ دیا کہ بینک انٹرسٹ ربا ہے' لہٰذا اسے ملکی معیشت سے ''دیس نکالا'' دیا جائے۔ پھر اسی کونسل نے ۱۹۸۰ء میں بلاسود نظام معیشت پر تفصیلی رپورٹ مرتب کر کے حکومتِ وقت کو پیش کی۔ بعدازاں ۱۹۸۴ء میں مارک اپ فائنانسنگ پر تنبیہی رپورٹ جاری کر کے کونسل نے اپنی ہی سابقہ رپورٹ کی بعض کمزوریوں کا ازالہ کر دیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۱ء میں فیڈرل شریعت کورٹ کے سہ رکنی بینچ نے طویل سماعت کے بعد یہ تاریخی فیصلہ جاری کیا کہ بینک انٹرسٹ ربا ہونے کی بنا پر اس لائق ہے کہ اس سے متعلقہ قوانین کو قانون کی کتابوں سے خارج کیا جائے اور جون ۱۹۹۲ء تک متبادل قانون فراہم کر کے ان کے مطابق معاملات کو استوار کیا جائے۔ بجائے اس فیصلے پر خلوص سے عملدرآمد کرنے کے' مفاد پرستوں کے ایک گروہ نے اس فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کر دی اور یوں معاملے کو طویل مدت کے لئے التواء میں ڈال دیا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں ہی کمیشن فار اسلامائزیشن آف اکانومی نے بھی غیر سودی نظامِ معیشت پر اپنی تفصیلی رپورٹ کا بینہ کو پیش کر کے حکومت وقت پر اتمامِ حجت کر دی۔

۱۹۹۷ء میں اس وقت کے وزیراعظم نے انجمن خدام القرآن کے صدر مؤسس جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ایک نجی ملاقات میں وعدہ کیا کہ غیر سودی نظام معیشت پر مثبت پیش رفت کے ضمن میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا جائے گا۔ اس دوران انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے پلیٹ فارم سے مظاہروں' سیمینارز اور مراسلاتی مہم کے ذریعے انسدادِ سود کے حق میں ایک بھرپور مہم بھی چلائی گئی۔ لیکن کافی مدت گذار دینے کے باوجود حکومتی سطح پر کسی مثبت پیش رفت کے آثار نظر نہیں آئے۔ بالآخر ۱۹۹۹ء میں سپریم کورٹ نے اس کیس کی سماعت کے لئے پانچ رکنی شریعت ایپلٹ بینچ تشکیل دیا اور ایک مرتبہ پھر تمام امور پر بالکل ابتداء سے بحث کا آغاز کیا۔ تقریباً چار پانچ ماہ پر محیط سماعتی نشستوں کے بعد فاضل عدالت نے منجملہ انہی فیصلوں کا اعادہ کیا جو آٹھ برس قبل فیڈرل شریعت کورٹ نے دیئے تھے۔ سپریم کورٹ کے ایک ہزار سے

زائد صفحات پر مشتمل اس فیصلے میں حکومتی اداروں کو پابند کیا گیا تھا کہ جون ۲۰۰۱ء تک غیر سودی نظام کے جملہ تقاضے پورے کر کے معاملات کو اسلامی طریقوں کے مطابق استوار کیا جائے۔ ایک آزاد عدلیہ کے اس فیصلے پر قوم نے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا' اس لئے کہ اب امکان پیدا ہو گیا تھا کہ اللہ کے خلاف چھیڑی گئی جنگ سے رُستگاری کے حالات فراہم ہو سکیں۔

یہاں ایک مرتبہ پھر ہماری قومی اور اجتماعی بدقسمتی نے سر اٹھایا۔ کورٹ کے اس فیصلے کی شکل میں اللہ کی طرف سے اتمام حجت قائم ہو جانے کے باوصف حکومتِ وقت نے یو بی ایل کے کاندھوں پر رکھ کر یہ بندوق چلائی کہ جب کورٹ کے فیصلے کے مطابق مدتِ مہلت نزدیک آئی تو معلوم ہو کہ اس فیصلے کے خلاف کہیں 'عالمِ بالا ہی بالا' میں ایک ریویو پٹیشن سپریم کورٹ میں دائر کی جا چکی ہے۔ ریویو پٹیشن کی سماعت کا وقت آیا تو کیفیت یہ تھی کہ سابقہ بینچ کے ججز میں سے تین ججز پی سی او کے تحت حلف نہ اٹھانے کی بنا پر یا کسی دوسرے سبب سے ریٹائر ہو چکے تھے۔ جو دو باقی تھے ان میں سے ایک فاضل جج ۱۹۹۹ء کے فیصلے کے signatory ہونے کے باوجود اب بالکل مختلف انداز میں کورٹ کی نمائندگی کر رہے تھے۔ بقیہ ججز بالکل نئے تھے..... بہرحال اس موقع پر بینچ نے سابقہ فیصلے میں یہ تبدیلی کر دی کہ اب مدتِ مہلت (deadline) جون ۲۰۰۱ء نہیں بلکہ جون ۲۰۰۲ء شمار کی جائے گی۔ گویا transformation کے لئے مزید ایک سال کی مہلت دے دی گئی۔

اللہ کے خلاف اعلان جنگ جاری رکھنے کی یہ مہلت بھی بنام خدا مکمل ہوئی تو ایک مرتبہ پھر کورٹ میں سٹیج سجایا گیا۔ اب کی بار یہ تدبیر پہلے سے ہی کر لی گئی تھی کہ بینچ میں موجود وہ واحد جج جو عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ سابقہ فیصلوں کے 'شاہد' بھی تھے، انہیں بیک نوک قلم منصبِ منصفی سے ہٹا دیا گیا..... نہ نو من تیل ہو گا نہ رادھا ناچے گی! قصہ مختصر' نوبت بایں جا رسید' کہ اب پی سی او پر حلف اُٹھائی ہوئی عدالت نے اپنے ہی سابقہ فیصلے کو کالعدم قرار دینے میں کوئی عار محسوس نہ کی اور یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ ۱۹۹۹ء والا فیصلہ عدل کے تقاضوں سے متجاوز تھا، لہٰذا کالعدم کیا جاتا ہے اور معاملہ شریعت کورٹ کی طرف لوٹایا جاتا ہے تاکہ وہ بھی اپنے ۱۹۹۱ء والے فیصلے پر نظرِ ثانی کر لے! اس فیصلے کا اور کوئی فائدہ ہو نہ ہو' ایک فائدہ ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی صداقت کے لئے زندہ مثال ہاتھ آ جاتی ہے۔

''بندگی'' میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور ''آزادی'' میں بحر بیکراں ہے زندگی!

(باقی صفحہ 38 پر)

تعارفِ قرآن (۲)

از: ڈاکٹر اسرار احمد

قرآن مجید کی زبان

اب آیئے اگلی بحث کی طرف کہ قرآن مجید کی زبان کیا ہے اور اس زبان کی شان کیا ہے؟ یہ بات بھی قرآن مجید نے بہت تکرار و اعادہ کے ساتھ بیان کی ہے کہ یہ قرآن عربی مبین میں ہے' یعنی شستہ' صاف' سلیس' کھلی اور واضح عربی میں ہے۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اس نے جن حروف و اصوات کا جامہ پہنا' وہ حروف و اصوات لوحِ محفوظ میں ہیں۔ اس کے بعد وہ کلام الٰہی' قولِ جبرائیل علیہ السلام اور قول محمد ﷺ بن کر نازل ہوا اور لوگوں کے سامنے آیا۔ چنانچہ سورۃ الزخرف کے آغاز میں ارشاد ہوا:

﴿حٰمٓ ۚ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۚ﴾

''حٰمٓ۔ قسم ہے اس واضح کتاب کی! ہم نے اسے قرآنِ عربی بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو''۔

قرآن کی مخاطب اوّل قوم حجاز میں آباد تھی۔ اس سے کہا جا رہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں بنایا۔ اس نے اولاً حروف و اصوات کا جامہ پہنا ہے' پھر تمہاری زبان عربی کا جامہ پہن کر تمہارے سامنے نازل کیا گیا ہے تاکہ تم اس کو سمجھ سکو۔

یہی بات سورۃ یوسف کے شروع میں کہی گئی ہے:

﴿الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۚ﴾

''ا ل ر۔ یہ اس کتاب کی آیات ہیں جو اپنا مدعا صاف صاف بیان کرتی ہے۔
ہم نے اسے نازل کیا ہے قرآن بنا کر عربی زبان میں تا کہ تم سمجھ سکو۔''

سورۃ الشعراء میں فرمایا:

بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ﴿١٩٥﴾

''صاف صاف عربی زبان میں (نازل کیا گیا)۔''

سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا:

قُرْآنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِي عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٢٨﴾

''ایسا قرآن جو عربی زبان میں ہے' جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں ہے' تا کہ وہ بچ کر چلیں۔''

اس میں کہیں کجی نہیں' کہیں کوئی ایچ پیچ نہیں' اس کی زبان بہت سلیس' شستہ اور بالکل واضح زبان ہے۔ اس میں کہیں پہیلیاں بجھوانے کا انداز نہیں ہے۔

اب نوٹ کیجئے کہ قرآن کی عربی کون سی عربی ہے؟ اس لئے کہ عربی زبان ایک ہے مگر اس کے dialects اور اس کی بولیاں بے شمار ہیں۔ خود جزیرہ نمائے عرب میں متعدد بولیاں تھیں' تلفظ اور لہجے مختلف تھے۔ بعض الفاظ کسی خاص علاقے میں مستعمل تھے اور دوسرے علاقے کے لوگ ان الفاظ کو جانتے ہی نہیں تھے۔ آج بھی کہنے کو تو مصر' لیبیا' الجزائر' موریطانیہ اور حجاز کی زبان عربی ہے' لیکن جو اُن کے ہاں فصیح عربی کہلاتی ہے وہ تو ایک ہے۔ وہ درحقیقت ایک اس لئے ہے کہ قرآن مجید نے اسے دوام عطا کیا ہے۔ یہ قرآن مجید کا عربی زبان پر عظیم احسان ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں کوئی زبان بھی ایسی نہیں ہے جو چودہ سو برس سے ایک ہی شان اور ایک ہی کیفیت کے ساتھ باقی ہو۔ اردو زبان ہی کو دیکھئے۔ ۱۰۰ اور ۲۰۰ برس پرانی اردو آج ہمارے لئے ناقابل فہم ہے۔ دکن کی اردو ہمیں سمجھ میں نہیں آ سکتی' اس میں کتنی تبدیلی ہوئی ہے۔ اسی طرح فارسی زبان کا معاملہ ہے۔ ایک وہ فارسی تھی جو عربوں کی آمد اور اسلام کے ظہور کے وقت تھی۔ عربوں کے ہاتھوں ایران فتح ہوا تو رفتہ رفتہ اس فارسی کا رنگ بدلتا گیا۔ اب اس کو پھر بدلا گیا ہے اور اس میں سے عربی الفاظ نکال کر اس کے لہجے بھی

بدل دیئے گئے ہیں۔ ایک فارسی وہ ہے جو افغانستان میں بولی جاتی ہے' وہ ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ اس لئے کہ جو فارسی یہاں پڑھائی جاتی تھی وہ یہی فارسی تھی۔ آج جو فارسی ایران میں پڑھائی جا رہی ہے وہ بہت مختلف ہے' اپنے لہجے میں بھی اور اپنے الفاظ کے اعتبار سے بھی ——— لیکن عربی ''فصیح زبان'' ایک ہے۔ یہ اصل میں حجاز کے بدوؤں کی زبان تھی۔ پورا قرآن حکیم حجاز میں نازل ہوا۔ حجاز میں بادیہ نشین تھے۔ عربوں کا کہنا تھا کہ خالص زبان بادیہ نشینوں کی ہے' شہر والوں کی نہیں۔ جبکہ مکہ شہر تھا اور وہاں باہر سے بھی لوگ آتے تھے۔ قافلے آ رہے ہیں' جا رہے ہیں' ٹھہر رہے ہیں۔ جہاں اس طرح کی آمد و رفت ہو وہاں زبان خالص نہیں رہتی اور اس میں غیر زبانوں کے الفاظ شامل ہو کر مستعمل ہو جاتے ہیں اور بول چال میں آ جاتے ہیں۔ خاص اسی وجہ سے شرفاء اپنے بچوں کو پیدائش کے فوراً بعد بادیہ نشینوں کے پاس بھیج دیتے تھے۔ ایک تو دودھ پلانے کا معاملہ تھا۔ دوسرا یہ کہ ان کی زبان صاف رہے' خالص عربی زبان رہے اور وہ ہر ملاوٹ سے پاک رہے۔ تو قرآن مجید حجاز کے بادیہ نشینوں کی زبان میں نازل ہوا۔ البتہ یہ ثابت ہے کہ قرآن مجید میں کچھ الفاظ دوسرے قبائل اور دوسرے علاقوں کی زبانوں کے بھی آئے ہیں۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ غیر عربی الفاظ بھی قرآن مجید میں آئے ہیں جو مُعرّب ہو گئے ہیں۔ ابراہیم' اسمٰعیل' اسرائیل' اسحاق' یہ تمام نام درحقیقت عبرانی زبان کے الفاظ ہیں۔ لفظ ''اِیل'' عبرانی زبان میں اللہ کے لئے آتا ہے اور یہ لفظ ہمارے ہاں قرآن مجید کے ذریعے آیا ہے۔ اسی طریقے سے ''سِجّیل'' کا لفظ فارسی سے آیا ہے۔ صحرا میں کہیں بارش کے نتیجے میں ہلکی سی پھوار پڑی ہو تو بارش کے قطروں کے ساتھ ریت کے چھوٹے چھوٹے دانے بن جاتے ہیں اور پھر تیز دھوپ پڑنے پر وہ ایسے پک جاتے ہیں جیسے بھٹے میں اینٹوں کو پکا دیا گیا ہو۔ یہ کنکر ''سجیل'' کہلاتے ہیں جو ''سنگِ گل'' کا معرب ہے۔ باقی اکثر و بیشتر قرآن مجید کی زبان جس میں یہ نازل ہوا' وہ حجاز کے علاقے بادیہ نشینوں کی عربی ہے' جس میں فصاحت و بلاغت

نقطۂ عروج پر ہے اور اس کا لوہا مانا گیا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید میں ایک صوتی آہنگ ہے۔ اس کا ایک ''ملکوتی غنا'' (Devine Music) ہے' اس کی ایک عذوبت اور مٹھاس ہے۔ یہ دونوں چیزیں عرب میں پورے طور پر تسلیم کی گئی ہیں اور لوگوں پر سب سے زیادہ مرعوبیت قرآن حکیم کی فصاحت' بلاغت اور عذوبت ہی سے طاری ہوئی۔ ان کی اپنی زبان میں ہونے کے اعتبار سے ظاہر بات ہے کہ قرآن کے بہترین ناقد بھی وہی ہو سکتے تھے۔ واضح رہے کہ ادب میں ''تنقید'' دونوں پہلوؤں کو محیط ہوتی ہے۔ کسی چیز کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا' اسے جانچنا' پرکھنا۔ اس میں کوئی خامی ہو تو اس کو نمایاں کرنا' اور اگر کوئی محاسن ہوں تو ان کو سمجھنا اور بیان کرنا۔ اس اعتبار سے اس کی فصاحت و بلاغت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ عربی زبان آج بھی مختلف علاقوں میں مختلف لہجوں اور بولیوں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایک علاقے کی عامی (colloquial) عربی دوسرے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ خود نزولِ قرآن کے زمانے میں نجد کے لوگوں کی زبان حجاز کے لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس کی وضاحت ایک حدیث میں بھی ملتی ہے کہ نجد سے کچھ لوگ آئے اور وہ حضور ﷺ سے گفتگو کر رہے تھے جو بڑی مشکل سے سمجھ میں آ رہی تھی اور لوگ اسے سمجھ نہیں پا رہے تھے۔ آج بھی نجد کے لوگ جو گفتگو کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ عربی سے واقفیت ہونے کے باوجود ان کی عربی ہماری سمجھ میں نہیں آتی' ان کا لب و لہجہ بالکل مختلف ہے۔ قرآن حکیم کی زبان حجاز کے بادیہ نشینوں کی ہے۔ لہٰذا اگر تحقیق و تدبر قرآن کا حق ادا کرنا ہو تو جاہلیت کی شاعری پڑھنا ضروری ہے۔ ائمہ لغت نے ایک ایک لفظ کی تحقیق کر کے اور بڑی گہرائیوں میں اتر کر جاہلی شاعری کے حوالے سے جتنے بھی استشہاد ہو سکتے تھے ان کو کھنگال کر قرآن میں مستعمل الفاظ کے مادوں کے مفہوم معین کر دیئے ہیں۔ ایک عام قاری کو' جو قرآن سے تذکر کرنا چاہے' صرف ہدایت حاصل کرنا چاہے' اس کھکیڑ میں پڑنے کی چنداں

ضرورت نہیں ہے۔ البتہ تدبر قرآن کے لئے جب تحقیق کی جاتی ہے تو جب تک کسی ایک لفظ کی اصل پوری طرح معلوم نہ کی جائے اور اس کے بال کی کھال نہ اتار لی جائے تحقیق کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے شعر جاہلی کی زبان کو سمجھنا تدبر قرآن کے لئے یقیناً ضروری ہے۔

قرآن کے اسماء وصفات

اگلی بحث قرآن حکیم کے اسماء وصفات کی ہے۔ علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الاتقان فی علوم القرآن'' میں قرآن حکیم کے اسماء وصفات قرآن حکیم ہی سے لے کر پچپن (۵۵) ناموں کی فہرست مرتب کی ہے۔ میں نے جب اس پر غور کیا تو اندازہ ہوا کہ وہ بھی کامل نہیں ہے' مثلاً لفظ ''برہان'' ان کی فہرست میں شامل نہیں ہے۔ درحقیقت قرآن مجید کی صفات' اس کی شانوں اور اس کی تاثیر کے لئے مختلف الفاظ کو جمع کیا جائے تو ۵۵ ہی نہیں اس سے زیادہ الفاظ بن جائیں گے' لیکن میں نے انہیں دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک تو وہ الفاظ ہیں جو مفرد کی حیثیت سے اور معرفہ کی شکل میں قرآن مجید میں قرآن کے لئے وارد ہوئے ہیں' جبکہ کچھ صفات ہیں جو موصوف کے ساتھ آ رہی ہیں۔ مثلاً ''قرآن مجید'' میں ''مجید'' قرآن کا نام نہیں ہے' درحقیقت صفت ہے۔ اسی طرح ''القرآن المجید'' میں اگرچہ ''الف لام'' کے ساتھ ''المجید'' آتا ہے' لیکن یہ چونکہ موصوف کے ساتھ مل کر آیا ہے لہٰذا یہ بھی صفت ہے۔

قرآن مجید کے لئے جو الفاظ بطور اسم آئے ہیں' ان میں سے اکثر و بیشتر وہ ہیں جن کے ساتھ لام تعریف لگا ہوا ہے۔ قرآن کے لئے اہم ترین نام جو اس کا امتیازی اور اختصاصی (The exclusive) نام ہے ''القرآن'' ہے۔ (میں بعد میں اس کی وضاحت کروں گا)۔ اس کے بعد کثرت سے استعمال ہونے والا نام ''الکتاب'' ہے۔ قرآن کی اصل حقیقت پر روشنی ڈالنے والا اہم ترین نام ''الذکر'' ہے۔ قرآن مجید کی افادیت کے لئے سب سے زیادہ جامع نام ''الہدیٰ'' ہے۔ قرآن مجید کی نوعیت اور حیثیت کے اعتبار سے اہم ترین نام ''النور'' ہے۔ قرآن مجید کی ایک انتہائی اہم شان

جو ایک لفظ کے طور پر آئی ہے ''الفرقان'' ہے۔ یعنی (حق و باطل میں) فرق کر دینے والی شے' دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دینے والی شے۔ قرآن کا ایک نام ''الوحی'' بھی آیا ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَا اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ﴾ (الانبیاء:۴۵)۔ اسی طرح ''کلام اللہ'' کا لفظ بھی خود قرآن میں آیا ہے: ﴿حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ:۶) چونکہ یہاں کلام مضاف واقع ہوا ہے' لہٰذا یہ بھی معرفہ بن گیا۔ میرے نزدیک جنہیں ہم قرآن کے نام قرار دیں' وہ تو یہی بنتے ہیں۔ اگرچہ' جیسا کہ میں نے عرض کیا' جو لفظ بھی قرآن کے لئے صفت کے طور پر یا اس کی شان کو بیان کرنے کے لئے قرآن میں آ گیا ہے علامہ جلال الدین سیوطی نے اس کو فہرست میں شامل کر کے ۵۵ نام گنوائے ہیں' لیکن یہ فہرست بھی مکمل نہیں۔

قرآن کریم کی مختلف شانوں اور صفات کے لئے یہ الفاظ آئے ہیں: (۱) كَرِيْمٌ: ﴿اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ﴾ (الواقعۃ) (۲) اَلْحَكِيْمُ: ﴿يٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ﴾ (یٰسٓ) (۳) اَلْعَظِيْمُ: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ﴾ (الحجر) (۴) مَجِيْدٌ اور اَلْمَجِيْدُ: ﴿بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ﴾ (البروج) اور ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ﴾ (ق) (۵) اَلْمُبِيْنُ: ﴿حٰمٓ ۚ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ﴾ (الزخرف) (۶) رَحْمَةٌ: ﴿هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس) (۷) عَلِيٌّ: ﴿وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ﴾ (الزخرف) (۸) بَصَائِرُ: ﴿قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ﴾ (الانعام:۱۰۴) (۹) بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا: (حٰمٓ السجدۃ:۴) اگرچہ یہ الفاظ انبیاء کے لئے آتے ہیں لیکن یہاں خود قرآن کے لئے بھی آئے ہیں۔ قرآن اپنی ذات میں فی نفسہٖ بشیر بھی ہے' نذیر بھی ہے۔ (۱۱) بُشْرٰى: ﴿وَبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (النحل:۸۹، ۱۰۲) (۱۲) عَزِيْزٌ: ﴿وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۙ﴾ (حٰمٓ السجدۃ) (۱۳) بَلَاغٌ: ﴿هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ﴾ (ابراھیم:۵۲) (۱۴) بَيَانٌ: ﴿هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ﴾ (آل عمران ۱۳۸) (۱۵) مَوْعِظَةٌ (۱۶) شِفَآءٌ: ﴿قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ (یونس:۵۷) (۱۷) اَحْسَنُ

الْقَصَصِ: ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ﴾ (یوسف:۳) (۱۸) اَحْسَنُ الْحَدِيْثِ (۱۹) مُتَشَابِه (۲۰) مَثَانِيَ: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ (الزمر:۲۳) (۲۱) مُبَارَكٌ: ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ﴾ (ص:۲۹) (۲۲) مُصَدِّقٌ (۲۳) مُهَيْمِنٌ: ﴿مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ (المائدۃ:۴۸) (۲۴) قَيِّم: ﴿قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِنْ لَّدُنْهُ﴾ (الکہف:۲) یہ مختلف الفاظ ہیں جو قرآن حکیم کی مختلف شانوں کے لئے آئے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے (۹۹) نام ہیں' جو اس کی مختلف شانوں کو ظاہر کرتے ہیں' اسی طرح حضور ﷺ کے ناموں کی فہرست بھی آپ نے پڑھی ہوگی۔ آپ ﷺ کی مختلف شانیں ہیں' اس کے اعتبار سے آپ بشیر بھی ہیں' نذیر بھی ہیں' ہادی بھی ہیں' معلم بھی ہیں۔ قرآن مجید کے بھی مختلف اسماء وصفات ہیں۔

لفظ ''قرآن'' کی لغوی بحث:

قرآن مجید کے ناموں میں سب سے اہم نام ''القرآن'' ہے' جس کے لئے میں نے لفظ exclusive استعمال کیا تھا کہ یہ کسی اور کتاب کے لئے استعمال نہیں ہوا' ورنہ تورات کتاب بھی ہے' ہدایت بھی تھی' اور اس کے لئے لفظ نور بھی آیا ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿اِنَّا اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ﴾ (المائدۃ:۴۴) ''ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت بھی ہے اور نور بھی''۔ خود قرآن مجید ہدایت بھی ہے' نور بھی ہے' رحمت بھی ہے۔ تو بقیہ تمام اوصاف تو مشترک ہیں' لیکن القرآن کے لفظ کا اطلاق کتب سماویہ میں سے کسی اور کتاب پر نہیں ہوتا۔ یہ امتیازی' اختصاصی اور استثنائی نام صرف قرآن مجید کے لئے ہے۔ اسی لئے ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم علم ہے' اور اسم جامد ہے' اسم مشتق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام ''اللہ'' کے بارے میں بھی ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم ذات ہے' اسم علم ہے' اسم جامد ہے' مشتق نہیں ہے' یہ کسی اور مادے سے نکلا ہوا نہیں ہے۔ جبکہ ایک رائے یہ ہے کہ یہ بھی صفت ہے' جیسے اللہ تعالیٰ کے دوسرے صفاتی نام ہیں۔ جیسے ''علیم'' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے اور ''العلیم'' نام ہے' رحیم صفت ہے اور

''الرحیم'' نام ہے' اسی طرح الٰہ پر ''ال'' داخل ہوا تو ''الالٰہ'' بن گیا اور دو لام مدغم ہونے سے یہ ''اللہ'' بن گیا۔ یہ دوسری رائے ہے۔ جو معاملہ لفظ اللہ کے بارے میں اختلافی ہے بعینہٖ وہی اختلاف لفظ قرآن کے بارے میں ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ اسم جامد اور اسم علم ہے' اس کا کوئی اور مادہ نہیں ہے' جبکہ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ اسم مشتق ہے۔ لیکن پھر اس کے مادے کی تعیین میں اختلاف ہے۔

ایک رائے کے مطابق اس کا مادہ ''قرن'' ہے' یعنی قرآن میں جو ''ن'' ہے وہ بھی حرفِ اصلی ہے۔ دوسری رائے کے مطابق اس کا مادہ ''ق ر ء'' ہے۔ یہ گویا مہموز ہے۔ میں یہ باتیں اہل علم کی دلچسپی کے لئے عرض کر رہا ہوں۔ جن لوگوں نے اس کا مادہ ''قرن'' مانا ہے' اُن کی بھی دو رائیں ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ جیسے عرب کہتے ہیں ''قَرَنَ الشَّیءَ بِالشَّیْءِ'' (کوئی شے کسی دوسرے کے ساتھ شامل کر دی گئی) تو اس سے قرآن بنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی آیات' اللہ تعالیٰ کا کلام جو وقتاً فوقتاً نازل ہوا' اس کو جب جمع کر دیا گیا تو وہ ''قرآن'' بن گیا۔ امام اشعری بھی اس رائے کے قائل ہیں۔ جبکہ ایک رائے امام فراء کی ہے' جو لغت کے بہت بڑے امام ہیں' کہ یہ قرینہ اور قرائن سے بنا ہے۔ قرائن کچھ چیزوں کے آثار ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی آیات چونکہ ایک دوسرے سے مشابہ ہیں' جیسا کہ سورۃ الزمر میں قرآن مجید کی یہ صفت وارد ہوئی ہے ''کِتَابًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ''۔ اس اعتبار سے آپس میں یہ آیات قرناء ہیں۔ چنانچہ قرینہ سے قرآن بن گیا ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کا مادہ ق ر ء ہے وہ قرآن کو مصدر مانتے ہیں۔ قَرَأَ یَقْرَأُ قَرْأً وَقِرَاءَۃً وَقُرْآنًا۔ یہ اگرچہ مصدر کا معروف وزن نہیں ہے لیکن اس کی مثالیں عربی میں موجود ہیں۔ جیسے رَجَحَ سے رُجحان اور غَفَرَ سے غُفران۔ ان کے مادہ میں ''ن'' شامل نہیں ہے۔ تو جیسے غفران اور رجحان مصدر ہیں' ایسے ہی قرأ سے مصدر قرآن ہے' یعنی پڑھنا۔ اور مصدر بسا اوقات مفعول کا مفہوم دیتا ہے۔ تو قرآن کا مفہوم ہوگا پڑھی جانی والے شے' پڑھی گئی شے۔ ''قَرَأَ'' میں جمع کرنے کا مفہوم بھی

ہے۔عرب کہتے ہیں: قراتُ الْمَاءَ فِی الْحَوْضِ ''میں نے حوض کے اندر پانی جمع کر لیا''۔ اسی سے قریہ بنا ہے یعنی ایسی جگہ جہاں لوگ جمع ہو جائیں۔گویا قرآن کا مطلب ہے اللہ کا کلام جہاں جمع کر دیا گیا۔تمام آیات جب جمع کر لی گئیں تو یہ قرآن بن گیا۔ جیسے قریہ وہ جگہ ہے جہاں لوگ آباد ہو جائیں' مل جل کر رہ رہے ہوں۔تو جمع کرنے کا مفہوم قَرَءَ میں بھی ہے اور قرن میں بھی ہے۔یہ دونوں مادے ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔بہر حال یہ اس لفظ کی لغوی بحث ہے۔

قرآن کا اسلوبِ کلام

اب میں اگلی بحث پر آ رہا ہوں کہ اس کا اسلوب کلام کیا ہے! قرآن مجید نے شدو مد کے ساتھ جس بات کی نفی کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ شعر نہیں ہے۔ ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ﴾ (یٰسٓ :٦٩) ''ہم نے اپنے اس رسول کو شعر سکھایا ہی نہیں' نہ ان کے یہ شایانِ شان ہے''۔شعراء کے بارے میں سورۃ الشعراء میں آیا ہے:

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾﴾

''اور شاعروں کی پیروی تو وہی لوگ کرتے ہیں جو گمراہ ہوں۔کیا تو نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں گھومتے رہتے ہیں (ہر میدان میں سرگرداں رہتے ہیں) اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے۔''

اگلی آیت میں ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ......﴾ کے الفاظ کے ساتھ استثناء بھی آیا ہے' اور استثناء قاعدہ کلیہ کی توثیق کرتا ہے (Exception proves the rule)—— چنانچہ قرآن مجید کے اعتبار سے شعر گوئی کوئی اچھی شے نہیں' کوئی ایسی محمود صفت نہیں ہے کہ جو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو عطا فرماتا۔ بلکہ حضور اکرم ﷺ کا معاملہ تو یہ تھا کہ آپ کبھی کوئی شعر پڑھتے بھی تھے تو غلطی ہو جاتی تھی۔اس لئے کہ نبی اکرم ﷺ پر سے اللہ تعالیٰ شاعری کی تہمت ہٹانا چاہتا تھا' لہٰذا آپ کے اندر شاعری کا وصف ہی پیدا نہیں کیا گیا۔سیرت کا ایک دلچسپ واقعہ آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک

مرتبہ ایک شعر پڑھا اور اس میں غلطی ہوئی۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مسکرائے اور عرض کی: ''اَشْهَدُ اَنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ'' ''میں گواہی دیتا ہوں کہ یقیناً آپ اللہ کے رسول ہیں''۔ اس لئے کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ﴾۔ تو واقعتاً آپ کو شعر سے یعنی شعر کے وزن اور اس کے بحر وغیرہ سے مناسبت نہیں تھی۔ باقی جہاں تک شعر کے مفہوم کا اور اعلیٰ مضامین کا تعلق ہے تو خود حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ: ((اِنَّ مِنَ الْبَيَانِ لَسِحْرًا وَاِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِكْمَةً)) یعنی بہت سے بیان' بہت سے خطبے اور تقریریں جادو اثر ہوتے ہیں اور بہت سے اشعار کے اندر حکمت کے خزانے ہوتے ہیں۔ بعض شعراء کے اشعار حضور ﷺ نے خود پڑھے بھی ہیں اور ان کی تحسین فرمائی ہے' لیکن قرآن بہرحال شعر نہیں ہے۔

البتہ ایک بات کہنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ قدیم زمانے کی شاعری جس میں بحر' وزن اور ردیف و قافیہ کی پابندیاں سختی کے ساتھ ہوتی تھیں' اس کے اعتبار سے یقیناً قرآن شعر نہیں ہے' لیکن ایک شاعری جس کا رواج عصر حاضر میں ہوا ہے اور اس کے لئے غالباً قرآن ہی کے اسلوب کو چرایا گیا ہے' جسے آپ ''آزاد نظم'' (Blank Verse) کہتے ہیں' اس کے اندر جو صفات اور خصوصیات آج کل ہوتی ہیں اُن کا منبع اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اس لئے کہ اس میں ایک روھم بھی ہوتا ہے' اس میں فواصل بھی ہیں' قوافی کی طرز پر صوتی آہنگ بھی ہے' لیکن وہ جو معروف شاعری تھی اس کے اعتبار سے قرآن بڑی تاکید کے ساتھ کہتا ہے کہ قرآن شعر نہیں ہے۔

قرآن کے اسلوب کے ضمن میں دوسری اہم بات یہ ہے کہ عام معانی میں قرآن کتاب بھی نہیں ہے۔ میں یہاں اقبال کا مصرعہ quote کر رہا ہوں' اگرچہ اس کے وہ معانی نہیں ع ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!

آج ہمارا کتاب کا تصور یہ ہے کہ اس کے مختلف ابواب ہوتے ہیں۔ آپ کسی کتاب یا تصنیف میں ایک موضوع کو ایک باب (Chapter) کی شکل دیتے ہیں۔ ایک باب میں ایک بات مکمل ہو جانی چاہئے۔ اگلے باب میں بات آگے چلے گی' کوئی

پچھلی بات نہیں دہرائی جائے گی۔ تیسرے باب میں بات اور آگے چلے گی۔ ایک کتاب ایک مضمون کے اعتبار سے وحدت بنے گی اور اس کے اندر موضوعات اور عنوانات کے حوالے سے ابواب (Chapters) تقسیم ہو جائیں گے۔ اس اعتبار سے ہمارے ہاں جو معروف معنی میں کتاب کا اطلاق کیا جاتا ہے' اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔ البتہ یہ ''الکتاب'' ہے بمعنی لکھی ہوئی شے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے کتاب قرار دیا ہے اور اس کے لئے سب سے زیادہ کثرت سے یہی لفظ ''کتاب'' ہی قرآن میں آیا ہے۔ یہ لفظ ساڑھے تین سو (۳۵۰) جگہ آیا ہے۔ قرآن اور قرآناً تقریباً ۷۰ مقامات پر آیا ہے۔ لیکن ''قرآن'' exclusive آیا ہے' جبکہ کتاب کا لفظ توراۃ' انجیل' علم خداوندی اور تقدیر کے لئے بھی آیا ہے اور قرآن مجید کے حصّوں اور احکام کے لئے بھی آیا ہے۔ بہرحال کتاب اس معنی میں تو ہے۔ معاذ اللہ' کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ قرآن کتاب نہیں ہے' لیکن جس معنی میں ہم لفظ کتاب بولتے ہیں اس معنی میں قرآن کتاب نہیں ہے۔

تیسری بات یہ کہ یہ مجموعۂ مقالات (Collection of Essays) بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر مقالہ اپنی جگہ پر خود مکتفی اور ایک مکمل شے ہوتا ہے۔ لیکن قرآن مجید کے بارے میں ہم یہ بات نہیں کہہ سکتے۔ اب یہ ہے کیا؟ پہلی بات تو یہ نوٹ کیجئے کہ اس کا اسلوب خطبے کا ہے۔ عرب میں دو ہی چیزیں زیادہ معروف تھیں' خطابت یا شاعری۔ شعراء ان کے ہاں بڑے محبوب تھے۔ شاعری کا ان کو بڑا ذوق تھا اور وہ شعراء کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کے ہاں قصیدہ گوئی کے مقابلے ہوتے تھے۔ پھر ہر سال جو سب سے بڑا شاعر شمار ہوتا تھا اس کی عظمت کو تسلیم کرنے کی علامت کے طور پر سب شاعر اس کے سامنے باقاعدہ سجدہ کرتے تھے۔ پھر اس کا قصیدہ بیت اللہ پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ یہی قصائد ''سبعة معلّقة'' کے نام سے معروف ہیں۔ چنانچہ عرب یا تو شعروں سے واقف تھے یا خطبوں سے۔ تو قرآن مجید اُس دور کی دو سب سے زیادہ معروف اصناف (شاعری اور خطبہ) میں خطبے کے اسلوب پر ہے۔ اس اعتبار سے ہم

کہہ سکتے ہیں کہ قرآن حکیم مجموعۂ خطباتِ الٰہیہ (A Collection of Devine Orations) ہے' جس میں ہر سورت ایک خطبے کی مانند ہے۔

خطبے کے اعتبار سے چند باتیں نوٹ کر لیں۔ خطبے میں مخاطب اور خطیب کے درمیان ایک ذہنی رشتہ ہوتا ہے۔ مخاطب کو معلوم ہوتا ہے کہ میرے سامنے کون لوگ بیٹھے ہیں' ان کی فکر کیا ہے' ان کی سوچ کیا ہے' ان کے عقائد کیا ہیں' ان کے نظریات کیا ہیں۔ وہ ان کا حوالہ دیئے بغیر اپنی گفتگو کے اندر اُن پر تنقید بھی کرے گا' ان کی تصحیح بھی کرے گا' لیکن کوئی تمہیدی کلمات نہیں ہوں گے کہ اب میں تمہاری فلاں غلطی کی تصحیح کرنا چاہتا ہوں' میں اب تمہارے اس خیال کی نفی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ انداز نہیں ہوگا بلکہ وہ روانی کے ساتھ آگے چلے گا۔ مخاطِب اور مخاطَب کے مابین ایک ذہنی ہم آہنگی ہوتی ہے' وہ ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں' اور خاص طور پر مخاطبین کے فہم' اُن کی سمجھ' اُن کے عقائد' اُن کے نظریات سے وہ خطیب واقف ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت خطبے کی شان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں تحویل خطاب ہوتی ہے اور بغیر وارننگ کے ہوتی ہے۔ بسا اوقات غائب کو حاضر فرض کر کے اس سے خطاب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک خطیب مسجد میں خطبہ دے رہا ہے اور وہ مخاطب کر رہا ہے صدر مملکت کو' حالانکہ وہ وہاں موجود نہیں ہوتے۔ اسی طرح جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں بسا اوقات ان سے صیغہ غائب میں گفتگو شروع ہو جائے گی' اور یہ بھی بلاغت کا انداز ہے۔ کبھی وہ ایک طرف بات کر رہا ہے' کبھی دوسری طرف کر رہا ہے' کبھی کسی غائب سے بات کر رہا ہے اور خطابت کا وہی انداز ہوگا اگرچہ وہ غائب وہاں موجود نہیں ہے۔ اس کو تحویل خطاب کہتے ہیں۔ قرآن مجید پر غور کرنے کے ضمن میں اس کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر خطاب کا رُخ معین ہو کہ یہ بات کس سے کہی جا رہی ہے' مخاطب کون ہے' تو اس بات کا اصل مفہوم اجاگر ہو کر سامنے آتا ہے' ورنہ اگر مخاطب کا تعین نہ ہو تو بہت سے بڑے بڑے مغالطے جنم لے سکتے ہیں۔

خطبے اور مقالے میں ایک واضح فرق یہ ہوتا ہے کہ مقالے میں عام طور پر صرف

عقل سے اپیل کی جاتی ہے۔ اس میں منطق اور عقلی دلائل ہوتے ہیں' جبکہ خطبے میں عقل کے ساتھ ساتھ جذبات سے بھی اپیل ہوتی ہے۔ گویا کہ انسان کے اندر جھانک کر بات کی جاتی ہے۔ لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے کہ اپنے اندر جھانکو۔ ﴿وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴾ (الذّٰریٰت) ''اور خود تمہارے اندر بھی (نشانیاں ہیں) تو کیا تم کو سوجھتا نہیں ہے؟'' ﴿اَفِی اللّٰہِ شَکٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ (ابراھیم:۱۰) ''(ذرا غور کرو) کیا اللہ کے بارے میں شک کرتے ہو جو زمین و آسمان کا بنانے والا ہے؟'' یہ انداز بہرحال کسی تحریر یا مقالے میں نہیں ہو گا' یہ خطبے کا انداز ہے۔

ایک اور بات جو خطبے کے اعتبار سے اس کے خصائص میں سے ہے وہ یہ کہ ایک مؤثر خطبے کے شروع میں بہت جامع گفتگو ہوتی ہے۔ کامیاب خطبہ وہی ہو گا جس کا آغاز ایسا ہو کہ مقرر اور خطیب اپنے مخاطبین اور سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لے۔ اور پھر اگرچہ خطبے کے دوران مضمون دائیں بائیں پھیلے گا' اِدھر جائے گا' اُدھر جائے گا' لیکن آخر میں آ کر وہ پھر کسی مضمون کے اوپر مرتکز ہو جائے گا۔ یہ اگر نہیں ہے تو گویا کہ وقت ضائع ہو گیا۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے خطیب پیدا ہوئے ہیں۔ خاص طور پر احرار نے بڑے عوامی خطیب پیدا کئے' جن میں سے عطاء اللہ شاہ بخاری بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کی تقریر کا یہ عالم ہوتا تھا کہ گفتگو چار چار گھنٹے' پانچ پانچ گھنٹے چل رہی ہے۔ اس میں کبھی مشرق کی' کبھی مغرب کی' کبھی شمال کی اور کبھی جنوب کی بات آ جاتی۔ کبھی ہنسانے کا اور کبھی رلانے کا انداز ہوتا' کہیں لطیفہ گوئی بھی ہو جاتی۔ لیکن اوّل و آخر بات بالکل واضح ہوتی۔ خوب گھما پھرا کر بھی مخاطب کو کسی ایک بات پر لے آنا کہ اٹھے تو کوئی ایک بات' کوئی ایک پیغام لے کر اٹھے' کوئی ایک جذبہ اس کے اندر جاگ چکا ہو' ایک پیغام اس تک پہنچ چکا ہو' یہ خطبے کے اوصاف ہیں۔

آپ کو معلوم ہے خواہ غزل ہو یا قصیدہ' شاعری میں مطلع اور مقطع دونوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مطلع جاندار ہے تو آپ پوری غزل پڑھیں گے اور اگر مطلع ہی پھسپھسا ہے

تو آگے آپ کیا پڑھیں گے! اسی طرح مقطع بھی جاندار ہونا چاہئے۔ اسی لئے مقطع اور مطلع کے الفاظ علیحدہ سے وضع کئے گئے ہیں۔ خطبات کے اندر بھی ابتدا اور اختتام پر نہایت جامع اور اصل مضمون ہوتا ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدا اور اختتام بھی نہایت جامع مضامین پر ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورتوں کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات کی فضیلت پر بہت سی احادیث ملتی ہیں۔ سورۃ البقرہ کی ابتدائی آیات اور اختتامی آیات' اسی طرح سورۃ آل عمران کی شروع کی آیات اور پھر اختتامی آیات نہایت جامع ہیں۔ یہ انداز اکثر و بیشتر سورتوں میں ملے گا۔ یہ ہے اصل میں بالعموم قرآن مجید کا اسلوب' جو ظاہر بات ہے شاعری کا نہیں ہے۔ عام معانی میں وہ کتاب نہیں' مجموعۂ مقالات نہیں۔ اس کا اسلوب اگر ہے تو وہ خطبے سے ملتا ہے۔ یہ گویا خطباتِ الٰہیہ ہیں جن کا مجموعہ ہے قرآن!

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن و بانی تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے پانچ خطبات جو سالانہ محاضرات ۱۹۹۱ء میں دیئے گئے

حقیقت ایمان

تسوید و ترتیب:

مولانا ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

﴿اہم موضوعات﴾

■ ایمان کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم ■ ایمان کا موضوع
■ قانونی اور حقیقی ایمان کا فرق اور ان کے ضمن میں کلامی مباحث
■ ایمان و عمل کا باہمی تعلق ■ ایمان اور نفاق ■ ایمان حقیقی کے سرچشمے

اشاعت خاص: 90 روپے اشاعت عام: 50 روپے

فہم القرآن

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

از: لطف الرحمٰن خان

نظر ثانی: حافظ نذیر احمد ہاشمی

سورۃ البقرۃ (مسلسل)

آیت ۱۲۷

﴿وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝﴾

ق ع د

قَعَدَ (ن) قُعُوْدًا : بیٹھنا۔ ﴿وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ﴾ (التوبۃ: ۹۰) ''اور بیٹھے وہ لوگ جنہوں نے جھوٹ بولا اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے''۔

اُقْعُدْ (فعل امر): تو بیٹھ۔ ﴿وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ۝﴾ (التوبۃ) ''اور کہا گیا تم لوگ بیٹھو بیٹھنے والوں کے ساتھ''۔

قَاعِدٌ: فَاعِلٌ کے وزن پر اسم الفاعل ہے۔ بیٹھنے والا۔ ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝﴾ (المائدۃ) ''پس جائیں آپ اور آپ کا ربّ' تو دونوں قتال کریں' بیشک ہم یہیں بیٹھنے والے ہیں''۔

قُعُوْدٌ: یہ مصدر بھی ہے اور قَاعِدٌ کی جمع مکسر بھی ہے۔ یعنی اس کا معنی ''بیٹھنا'' بھی ہے اور ''بیٹھنے والے'' بھی ہے۔ ﴿اِنَّكُمْ رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ۝﴾ (التوبۃ) ''بیشک تم لوگ راضی ہوئے بیٹھنے پر پہلی مرتبہ' پس تم لوگ بیٹھو

پیچھے رہنے والوں کے ساتھ۔" ﴿اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ﴾ (البروج) "جب وہ لوگ اس پر (یعنی آگ پر) بیٹھنے والے ہیں۔"

قَاعِدَةٌ ج قَوَاعِدُ: یہ قَاعِدٌ کا مؤنث ہے۔ بیٹھنے والی۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: (۱) عمر رسیدہ خاتون۔ (۲) قاعدہ کلیہ اصول۔ (۳) بنیاد۔ ﴿وَالْقَوَاعِدُ مِنَ النِّسَآءِ الّٰتِىْ لَا يَرْجُوْنَ نِكَاحًا﴾ (النور:۶۰) "اور عمر رسیدہ خواتین عورتوں میں سے جو توقع نہیں کرتیں ... کی۔"

قَعِيْدٌ: یہ واحد جمع مذکر مؤنث سب کے لئے آتا ہے۔ فعیل کے وزن پر اسم الفاعل ہے۔ ہمیشہ بیٹھنے والا۔ محافظ۔ نگران۔ ﴿اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ﴾ (ق) "جب لیا دو لینے والوں نے دائیں سے اور بائیں سے وہ نگران ہیں (یعنی کراماً کاتبین فرشتے)۔"

مَقْعَدٌ ج مَقَاعِدُ: مَفْعَلٌ کے وزن پر اسم الظرف ہے۔ بیٹھنے کی جگہ۔ ﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ﴾ (التوبۃ:۸۱) "خوش ہوئے پیچھے کئے گئے لوگ اپنے بیٹھنے کی جگہ سے۔" ﴿تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ﴾ (آل عمران:۱۲۱) "آپؐ بٹھاتے تھے مؤمنوں کو بیٹھنے کی جگہوں پر (یعنی مورچوں پر) قتال کے لئے۔"

ترکیب: "اِبْرٰهٖمُ" اور "اِسْمٰعِيْلُ" کی رفع بتا رہی ہے کہ یہ دونوں "يَرْفَعُ" کے فاعل ہیں "اَلْقَوَاعِدَ" مفعول ہے اور "مِنَ الْبَيْتِ" "اَلْقَوَاعِدَ" سے حال ہونے کی بنا پر مقام نصب میں ہے اور تقدیر عبارت یوں ہے: "وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ كَائِنَةً مِنَ الْبَيْتِ"۔ "رَبَّنَا" میں "رَبَّ" کی نصب بتا رہی ہے کہ اس سے پہلے حرف نداء "یا" محذوف ہے۔ اور اس سے پہلے "يَقُوْلَانِ" بھی محذوف ہے۔ ان کا اسم ضمیر "كَ" ہے جبکہ "اَنْتَ" ضمیر فاصل ہے کیونکہ خبر معرف باللام ہے۔

<u>ترجمہ</u>

وَاِذْ: اور جب	يَرْفَعُ: بلند کر رہے تھے
اِبْرٰهٖمُ: ابراہیمؑ	الْقَوَاعِدَ: بنیادوں کو
مِنَ الْبَيْتِ: اس گھر کی	وَاِسْمٰعِيْلُ: اور اسماعیلؑ
رَبَّنَا: (تو وہ دونوں کہتے تھے) اے ہمارے رب	تَقَبَّلْ: تو قبول فرما

مِنَّا : ہم سے
اِنَّكَ اَنْتَ : بیشک تو ہی
السَّمِيْعُ : سننے والا
الْعَلِيْمُ : جاننے والا ہے

آیت ۱۲۸

﴿رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝﴾

ا م م

اَمَّ (ن) اِمَامَةً وَاَمًّا وَاِمَامًا ۔ الْقَوْمَ وَبِالْقَوْمِ : امام بننا۔

اُمَّةٌ : اُمت' جماعت' مدت' طریقہ' دین۔ ہر وہ جماعت جس کے ارکان میں کسی قسم کا کوئی رابطۂ اشتراک موجود ہو اُسے اُمت کہا جاتا ہے' خواہ یہ اتحاد مذہبی وحدت کی بنا پر ہو یا جغرافیائی اور عصری وحدت کی وجہ سے' اور خواہ اس رابطہ میں اُمت کے اپنے اختیار کو دخل ہو یا نہ ہو۔ اخفش نے تصریح کی ہے کہ اُمت باعتبار لفظ کے واحد ہے اور باعتبار معنی کے جمع۔ نیز حیوان کی ہر جنس ایک اُمت ہے۔ (ملاحظہ ہو عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری' ۱۹۸/۵' باب قول النبی ﷺ لا نکتب ولا نحسب) ابن درستویہ کا بیان ہے کہ جہاں بھی اُمت کے معنی مدت کے ہوں گے وہاں اس کا مضاف محذوف ہوگا اور مضاف الیہ مضاف کے قائم مقام سمجھا جائے گا۔ (ملاحظہ ہو فتح القدیر للشوکانی' ۲۹/۳)۔ اس لحاظ سے ﴿وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ﴾ اور ﴿وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ﴾ میں لفظ ''زَمن'' یا ''حِین'' محذوف ہے۔ گویا اصل میں یوں تھا: اِلٰى زَمَنِ اُمَّةٍ مَعْدُوْدَةٍ اور بَعْدَ حِيْنِ اُمَّةٍ۔ زَمن اور حِین کو حذف کر کے مضاف الیہ یعنی لفظ اُمت کو اس کا قائم مقام سمجھا گیا۔

اُمت کے مجازی معنی طریقہ اور دین کے بھی آتے ہیں۔ عرب بولتے ہیں: فُلَانٌ لَا اُمَّةَ لَهٗ۔ یعنی فلاں کا کوئی دین اور طریقہ نہیں۔ (عمدۃ القاری' ۱۹۸/۵)

ن س ك

نَسَكَ (ن) نَسْكًا: درویش بننا۔ بندگی کرنا۔ قربانی کرنا۔

نُسُكٌ (اسم الفعل): قربانی۔ ﴿اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (الانعام) ''بیشک میری نماز اور میری قربانی اور میرا عرصۂ حیات اور عرصۂ موت اللہ کے لئے ہے جو تمام عالموں کا ربّ ہے۔''

نَاسِكٌ (اسم الفاعل): بندگی کرنے والا۔ ﴿لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ﴾ (الحج: ٦٧) ''ہر ایک اُمت کے لئے ہم نے بنایا ایک بندگی کا طریقہ' وہ لوگ بندگی کرنے والے ہیں اس پر۔''

مَنْسَكٌ ج مَنَاسِكُ: مَفْعَلٌ کے وزن پر اسم الظرف ہے۔ بندگی کرنے کی جگہ۔ استعارۃً بندگی کے طریقہ کے لئے آتا ہے۔ لفظ ''مَنْسَكٌ'' کے لئے متذکرہ بالا آیت (الحج: ٦٧) دیکھیں۔ ''مَنَاسِكُ'' کا لفظ آیت زیر مطالعہ میں آیا ہے۔

ترکیب: ''وَاجْعَلْ'' کا مفعول اوّل ''نَا'' کی ضمیر ہے اور ''مُسْلِمَيْنِ'' مفعول ثانی ہے۔ ''وَ'' عطف ہے ''نَا'' ضمیر متکلم پر ''اجْعَلْ'' کے تحت ہے۔ ''مِنْ ذُرِّيَّتِنَا'' مفعول ثانی اور ''اُمَّةً مُّسْلِمَةً'' مفعول اوّل ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ''اُمَّةً'' مفعول اوّل ہے ''مِنْ ذُرِّيَّتِنَا'' ''اُمَّةً'' کی صفت ہے جو مقدم ہونے کی بنا پر حال ہے اور ''مُسْلِمَةً'' مفعول ثانی ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ''مِنْ ذُرِّيَّتِنَا'' اس کا مفعول اوّل اور مرکب توصیفی ''اُمَّةً مُّسْلِمَةً'' مفعول ثانی ہے۔ فعل امر ''اَرِ'' کا مفعول اوّل ''نَا'' کی ضمیر ہے اور مرکب اضافی ''مَنَاسِكَنَا'' مفعول ثانی ہے۔ اسی لئے ''مَنَاسِكَ'' منصوب آیا ہے۔

ترجمہ

رَبَّنَا: اے ہمارے ربّ	وَاجْعَلْنَا: اور تو بنا دے ہم دونوں کو
مُسْلِمَيْنِ: فرماں بردار	لَكَ: اپنا
وَ: اور (تو بنا دے)	مِنْ ذُرِّيَّتِنَا: ہماری نسل سے
اُمَّةً مُّسْلِمَةً: ایک فرماں بردار اُمت	لَّكَ: اپنی
وَ: اور	اَرِ: تو سمجھا دے
نَا: ہم کو	مَنَاسِكَنَا: ہماری بندگی کے طریقے
وَتُبْ عَلَيْنَا: اور تو توبہ قبول فرما ہماری	اِنَّكَ: بیشک تو
اَنْتَ التَّوَّابُ: ہی تو بار بار توبہ قبول کرنے والا	الرَّحِيْمُ: ہر حال میں رحم کرنے والا ہے

آیت ۱۲۹

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾

ع ز ز

عَزَّ (ض) عِزًّا: مغلوبیت سے محفوظ ہونا' سخت ہونا۔

عَزَّ (ن) عَزًّا: کسی پر غالب آنا۔ ﴿ وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ ﴾ (ص) ''اور وہ غالب آیا مجھ پر بات میں۔''

عِزٌّ: مصدر کے علاوہ اسم ذات بھی ہے۔ مغلوبیت سے حفاظت' پناہ' مدد۔ ﴿ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴾ (مریم) ''اور ان لوگوں نے بنایا اللہ کے علاوہ ایک الٰہ تاکہ وہ ہوں اُن کے لئے ایک پناہ۔''

عِزَّةٌ (اسم ذات): (۱) سختی' بے جا خودداری' گھمنڈ (۲) غلبہ' عزت۔ ﴿ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ﴾ (ص) ''جن لوگوں نے کفر کیا وہ گھمنڈ اور مخالفت کرنے میں ہیں۔'' ﴿ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا ﴾ (فاطر:۱۰) ''جو چاہا کرتا ہے عزت کو تو عزت کُل کی کُل اللہ کے لئے ہی ہے''۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو عزت اللہ تعالیٰ سے حاصل نہ ہو وہ سراسر ذلت ہے (مفردات)۔

عَزِيْزٌ ج اَعِزَّةٌ: فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ (۱) سخت' بھاری' گراں (۲) غالب' بالادست (جس کے اختیارات پر کوئی تحدیدات (limitations) نہ ہوں) ﴿ لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ ﴾ (التوبۃ:۱۲۸) ''آ چکا ہے تمہارے پاس ایک رسول تم میں سے' گراں ہے اس پر وہ جس سے تم لوگ مشکل میں پڑو۔'' ﴿ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (المائدۃ:۵۴) ''نرم ہیں مؤمنوں پر' سخت ہیں کافروں پر۔'' ﴿ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴾ (العنکبوت) ''بیشک وہی بالادست حکمت والا ہے۔''

اَعَزُّ: افعل التفضیل ہے۔ زیادہ سخت' زیادہ عزت والا۔ ﴿ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ﴾ (المنافقون:۸) ''لازماً نکالے گا زیادہ عزت والا اس میں سے زیادہ ذلت والے کو۔''

عُزّٰی: فُعْلٰی کے وزن پر افعل التفضیل کا مؤنث ہے۔ زیادہ سخت۔ زیادہ عزت والی۔ ''اَلْعُزّٰی'' ایک بُت کا نام۔ ﴿ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴾ (النجم) ''کیا تم نے دیکھا لات اور عزیٰ کو (بتوں کے نام)؟''

اَعَزَّ (افعال) اِعْزَازًا: کسی کو عزت دینا۔ ﴿ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ ﴾ (آل عمران:۲۶) ''اور تو عزت دیتا ہے اس کو جس کو تو چاہتا ہے اور تو ذلت دیتا ہے اس کو جس کو تو چاہتا ہے' تیرے ہاتھ میں کُل خیر ہے۔''

عَزَّزَ (تفعیل) تَعْزِیْزًا : کسی کو سخت کرنا' قوت دینا۔ ﴿ اِذْ اَرْسَلْنَا اِلَیْهِمُ اثْنَیْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ﴾ (یٰسٓ: ۱۴) ''جب ہم نے بھیجا ان کی طرف دو کو تو اُن لوگوں نے جھٹلایا دونوں کو' تو ہم نے تقویت دی تیسرے سے۔''

ترکیب : فعل امر ''اِبْعَثْ'' کا مفعول ''رَسُوْلًا'' ہے۔ فِیْهِمْ میں هُمْ کی ضمیر کا مرجع اُمّۃ ہے۔ پھر اُمت میں اگرچہ تاء تانیث لگی ہے' لیکن چونکہ معنی مذکر ہے اس لئے ضمیر مذکر ''هُمْ'' کی لوٹائی گئی۔ رَسُوْلًا نکرہ موصوفہ ہے' صفت ''مِنْهُمْ'' ہے۔ تقدیر عبارت ''یَتْلُوْ رَسُوْلًا كَائِنًا مِّنْهُمْ۔عَلَیْهِمْ'' سے لے کر ''یُزَكِّیْهِمْ'' تک یا تو صفت ہے یا حال ہے۔ ''یَتْلُوْا''، ''یُعَلِّمُ'' اور ''یُزَكِّیْ'' تینوں افعال مضارع ہیں' لیکن یہ دعا میں آئے ہیں' اس لئے ترجمہ میں اس کا لحاظ کرنا ہوگا۔

ترجمہ

رَبَّنَا : اے ہمارے ربّ	وَابْعَثْ : اور تو بھیج
فِیْهِمْ : ان میں	رَسُوْلًا : ایک ایسا رسول
مِّنْهُمْ : ان میں سے	یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ : جو پڑھ کر سنائے ان کو
اٰیٰتِكَ : تیری آیات	وَیُعَلِّمُهُمُ : اور جو تعلیم دے ان کو
الْكِتٰبَ : کتاب کی	وَالْحِكْمَةَ : اور حکمت کی
وَیُزَكِّیْهِمْ : اور جو تزکیہ کرے ان کا	اِنَّكَ : بیشک تو
اَنْتَ الْعَزِیْزُ : ہی تو بالادست	الْحَكِیْمُ : حکمت والا ہے

نوٹ (۱) : آج کے دور میں ہمارے لئے اس آیت میں کیا راہنمائی ہے' اس کو سمجھ لیں۔ ''یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ'' میں قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنا شامل ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے جو احکام' ہدایات اور ترغیبات دی ہیں' ان سے اللہ تعالیٰ کی حقیقی مرضی اور منشا کیا ہے' حضور ﷺ اس کی تعلیم دے گئے ہیں' اس لئے تعلیم کتاب میں ہمارے لئے احادیث کو بھی سمجھ کر پڑھنا شامل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام میں کیا حکمت مضمر ہے' یعنی ان احکام کے ''کیوں اور کیسے'' کی وضاحت بھی حضور ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کر گئے ہیں' جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ ان احکام پر ہمارے عمل کرنے یا نہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی بادشاہت میں نہ کوئی اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی کمی ہوتی ہے' بلکہ یہ احکام صرف اور صرف انسان کی عارضی اور دائمی' دونوں زندگیوں کی

بھلائی کے لئے دیئے گئے ہیں۔ یہ حقیقت اگر ذہن نشین ہو جائے تو پھر ان احکام پر عمل کرنا ہلکا اور آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے تعلیم حکمت میں ہمارے لئے سیرت اور آثارِ صحابہ کا مطالعہ شامل ہے۔

نوٹ (۲): اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کے الفاظ نقل کئے ہیں۔ آگے چل کر تین مقامات (البقرۃ:۱۵۱۔آل عمران:۱۶۴۔الجمعۃ:۲) پر اس دعا کی قبولیت کا اعلان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انہی الفاظ کو دہرایا ہے' البتہ ان کی ترتیب میں ایک تبدیلی کی ہے جو غور طلب ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں ترتیب یہ ہے: (۱) تلاوتِ آیات' (۲) تعلیم کتاب' (۳) تعلیم حکمت اور (۴) تزکیہ۔ دعا کی قبولیت کا اعلان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہ ترتیب رکھی ہے: (۱) تلاوتِ آیات' (۲) تزکیہ' (۳) تعلیم کتاب اور (۴) تعلیم حکمت۔ مذکورہ تبدیلی پر غور کرنے سے جو بات سامنے آتی ہے اسے سمجھ لیں۔

ایسے عقائد و نظریات جو اِس کائنات کی صداقتوں پر مبنی نہ ہوں' انسان کے اندر حُبِّ دنیا اور پھر حُبِّ عاجلہ کو جنم دیتے ہیں' جس کے نتیجے میں پھر انسان اپنی فطرت کی پکار کا گلا گھونٹنا شروع کر دیتا ہے۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے سے انسان کے سامنے وہ عقائد و نظریات آتے ہیں جو اس کائنات کی صداقتوں پر مبنی ہیں۔ ان سے انسان کی فطرت کی پکار کو تقویت حاصل ہوتی ہے' جس کے نتیجے میں اس کے اندر تقویٰ کا جذبہ ابھرتا ہے اور پروان چڑھتا ہے۔ یہ اصل تزکیہ ہے اور اس کا ذریعہ قرآن مجید ہے۔

تقویٰ کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی مرضی و منشا معلوم کرنے کی جستجو پیدا ہوتی ہے۔ پھر زندگی کو اس کے مطابق ڈھالنے کے لئے مطلوبہ قوتِ عمل بھی تقویٰ کا جذبہ ہی فراہم کرتا ہے۔ اس طرح انسان اللہ کے احکام پر عمل کرنا شروع کر دیتا ہے' خواہ ان کی حکمت اس کی سمجھ میں آئی ہو یا نہ آئی ہو۔ اس لئے تعلیم کتاب کو تزکیہ کے بعد اور تعلیم حکمت سے پہلے رکھا گیا ہے۔

تعلیم حکمت ایک اضافی سہولت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عطا کی ہے۔ جیسے آخرت پر ایمان اور یقین ہوتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اطمینانِ قلب کی درخواست کی تھی جسے اللہ تعالیٰ نے قبول فرمایا۔ (دیکھئے البقرۃ:۲۶۰) اس حوالے سے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ اپنے اعمال کی جواب دہی اور نتائج کے لئے انسان پر حجت اس کی

عقل نہیں بلکہ اس کی فطرت ہے' جس کے ساتھ اسے اس امتحان گاہ میں بھیجا جاتا ہے۔ فطرت کے ساتھ اسے عقل بھی دی جاتی ہے اور قرآن مجید عقل کی نفی نہیں کرتا' البتہ وہ ہر چیز کو اس کے صحیح مقام پر رکھتا ہے۔ اور قرآن نے عقل کو فطرت کے ماتحت رکھا ہے۔

نوٹ (۲): ایک رائے یہ ہے کہ اس آیت میں حضور ﷺ کے مقصدِ بعثت کا بیان ہے۔ لیکن میرا ذہن اس رائے کو ترجیح دیتا ہے کہ اس آیت میں آپؐ کے مقصدِ بعثت کو پورا کرنے کا طریقۂ کار (Modus Operendi) کا بیان ہے' جبکہ آپ ﷺ کے مقصدِ بعثت کا بیان التوبۃ: ۳۳' الفتح: ۲۸' اور الصف: ۹ میں آیا ہے۔

آیت ۱۳۰

﴿وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝﴾

ر غ ب

رَغِبَ (س) رَغْبًا: (۱) خواہش کرنا' (۲) التجا کرنا' مانگنا۔ اس معنی میں عموماً ''اِلٰی'' کے صلہ کے ساتھ آتا ہے۔ (۳) اعراض کرنا' مُنہ موڑنا۔ اس معنی میں عموماً ''عَنْ'' کے صلہ کے ساتھ آتا ہے۔ ﴿وَتَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ﴾ (النساء: ۱۲۷) ''اور تم لوگ چاہتے ہو کہ نکاح کرو اُن عورتوں سے۔''

رَاغِبٌ فَاعِلٌ کے وزن پر اسم الفاعل ہے۔ چاہنے والا' التجا کرنے والا' اعراض کرنے والا۔ ﴿اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝﴾ (التوبۃ) ''بیشک ہم اللہ سے التجا کرنے والے ہیں۔'' ﴿اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ﴾ (مریم: ۴۶) ''کیا اعراض کرنے والا ہے تو میرے معبودوں سے اے ابراہیم؟''

اِرْغَبْ (فعل امر): تو مانگ' التجا کر۔ ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ ۝﴾ (الانشراح) ''پس جب بھی فارغ ہو تو محنت کر اور اپنے ربّ سے مانگ۔''

ص ف و

صَفَا (ن) صَفْوًا: کسی چیز کا ہر طرح کی آمیزش سے پاک ہونا' صاف ہونا۔

صَفْوَانٌ: چکنا پتھر (جو مٹی وغیرہ کی آمیزش سے پاک ہو)۔ ﴿فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ﴾ (البقرۃ: ۲۶۴) ''تو اس کی مثال ایک چکنے پتھر کی مانند ہے جس پر کچھ مٹی ہو۔''

اَلصَّفَا : خانہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام (اس پہاڑی کا پتھر بالکل صاف اور چکنا ہے۔ ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ ۚ﴾ (البقرۃ:۱۵۸) ''بیشک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں۔''

اَصْفٰی (افعال) اِصْفَاءً : کسی کو آمیزش سے پاک کرنا' یعنی دوسروں سے الگ کر کے کسی کو کسی چیز یا کسی کام کے لئے مخصوص کرنا۔ ﴿اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ﴾ (بنی اسرائیل:۴۰) ''تو کیا مخصوص کیا تم لوگوں کو تمہارے رب نے بیٹوں کے لئے۔''

صَفّٰی (تفعیل) تَصْفِيَةً : کسی چیز کو آمیزش سے پاک کرنا' صاف کرنا۔

مُصَفًّى (اسم المفعول) : صاف کیا ہوا۔ ﴿وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ۭ﴾ (محمد:۱۵) ''اور نہریں ہیں صاف کی ہوئی شہد کی۔''

اِصْطَفٰی (افتعال) اِصْطِفَاءً : کسی کو اپنے لئے خاص کرنا۔ اس بنیادی مفہوم کے ساتھ دو معانی میں آتا ہے: (۱) چن لینا۔ (۲) منتخب کرنا۔ (۳) کسی کو دوسروں پر ترجیح دینا' پسند کرنا۔ ﴿اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰۗىِٕكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ۭ﴾ (الحج:۷۵) ''اللہ چن لیتا ہے فرشتوں میں سے کچھ رسول اور انسانوں میں سے۔'' ﴿اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ ۝﴾ (الصّٰفّٰت) ''کیا اُس نے ترجیح دی بیٹیوں کو بیٹوں پر؟''

مُصْطَفٰی (اسم المفعول) : چنا ہوا' پسند کیا ہوا۔ ﴿وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ ۝﴾ (ص) ''اور بیشک وہ سب ہمارے پاس چنے ہوئے نیک لوگوں میں سے ہیں۔''

ترکیب : ''يَرْغَبُ'' مرفوع آیا ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ ''مَنْ'' شرطیہ نہیں بلکہ استفہامیہ ہے۔ ''مَنْ'' مبتدأ ہے اور ''يَرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ'' جملہ فعلیہ بن کر ''مَنْ'' کی خبر ہے۔ ''اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ'' ''مَنْ'' مستثنیٰ ہونے کی بنا پر منصوب ہے یا ''يَرْغَبُ'' کی ضمیر سے بدل ہونے کی بنا پر حالت رفع میں ہے۔ ''مَنْ'' نکرہ موصوفہ ہے یا بمعنی ''اَلَّذِی'' ہے۔ ''نَفْسَهٗ'' سَفِهَ کا مفعول ہے' کیونکہ ''سَفِهَ'' بمعنی ''جَهِلَ'' ہے۔ اور تقدیر عبارت یوں ہے: ''اِلَّا مَنْ جَهِلَ خَلْقَ نَفْسِهٖ'' اس لئے ''نَفْسَهٗ'' تمیز نہیں ہے' کیونکہ تمیز اسم نکرہ جبکہ یہ اسم معرفہ ہے۔ اگرچہ فراء نے اس کو تمیز ہی مانا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ''نَفْسَهٗ'' منصوب بنزع الخافض ہے اور عبارت یوں ہے: سَفِهَ فِیْ نَفْسِهٖ۔ اور یہ اس صورت میں ہے کہ سَفِهَ کو متعدی بِنَفْسِهٖ نہ مانا جائے۔ لیکن ثعلب اور مبرد نے اس کو متعدی بنفسہ ہی لکھا ہے۔ تو اس صورت میں نَفْسَهٗ ' سَفِهَ کا مفعول بنے گا۔

''اصْطَفَيْنٰهُ'' میں ''ہٗ'' کی ضمیر ابراہیم علیہ السلام کے لئے ہے۔

ترجمہ

وَمَنْ : اور کون	يَّرْغَبُ عَنْ : اعراض کرتا ہے
مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ : ابراہیمؑ کے دین سے	اِلَّا مَنْ : سوائے اس کے جو
سَفِهَ : بیوقوف ہوا	نَفْسَهٗ : بلحاظ اپنے نفس کے
وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ : اور ہم نے چنا ہے اس کو	فِي الدُّنْيَا : دنیا میں
وَاِنَّهٗ : اور یقیناً وہ	فِي الْاٰخِرَةِ : آخرت میں
لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ : صالحین میں سے ہے	

آیت ۱۳۱

﴿اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾

ترکیب : ''اِذْ'' یا تو ''اصْطَفَيْنٰهُ'' کا ظرف ہے یا ''فِي الدُّنْيَا'' سے بدل ہے یا اس سے پہلے ''اُذْكُرْ'' فعل محذوف ہے۔ ''اِذْ قَالَ'' میں ''قَالَ'' کا فاعل ''رَبُّهٗ'' ہے۔ اس میں ''ہٗ'' کی ضمیر اور ''لَهٗ'' کی ضمیر دونوں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ہیں جن کا ذکر گزشتہ آیت میں آیا ہے۔ ''اَسْلِمْ'' کے بعد ''قَالَ'' کا فاعل اس میں شامل ''هُوَ'' کی ضمیر ہے اور یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے ہے۔ ''اَلْعٰلَمِيْنَ'' پر لامِ جنس ہے۔

ترجمہ

اِذْ قَالَ : جب کہا	لَهٗ : اس سے
رَبُّهٗ : اس کے ربّ نے	اَسْلِمْ : تو فرمانبردار ہو
قَالَ : (تو) اس نے کہا	اَسْلَمْتُ : میں فرماں بردار ہوا
لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ : تمام جہانوں کے ربّ کے لئے	

نوٹ (۱) : غور طلب بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ''اَسْلَمْتُ لَكَ'' نہیں کہا۔ شاید اس لئے کہ اس میں احسان رکھنے کا پہلو ہے۔ جیسے آج کل کے ماتحت اپنے افسر کی فرمانبرداری کر کے اس پر احسان دھرتے ہیں۔ اس لئے ''لَكَ'' کے بجائے ''لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' کہہ کر واضح کر دیا کہ انہوں نے فرمانبرداری اپنی ضرورت اور اپنے مفاد میں قبول کی ہے کسی پر احسان نہیں کیا ہے۔

سلسلۂ نباتات قرآن (قسط 8)

زَقُّوم

تحقیق وتحریر: سیّد قاسم محمود

اردو/ہندی: تھوہر	انگریزی: Euphorbia
سنسکرت: واجرا	عربی: زقّوم، لبّین، رمید
بنگالی: پتہ سج	نباتاتی نام: Eurphorbia

زقوم کا حوالہ قرآن مجید کی چار سورتوں کی انیس آیات میں آیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶۰:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِى الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝﴾

''اور (یاد کرواے نبیؐ!) جب ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ تیرے ربّ نے ان لوگوں کو گھیر رکھا ہے، اور یہ جو کچھ ابھی ہم نے تمھیں دکھایا ہے، اس کو اور اُس درخت کو جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے، ہم نے ان لوگوں کے لئے بس ایک فتنہ بنا کر رکھ دیا۔ ہم انہیں تنبیہہ پر تنبیہہ کئے جا رہے ہیں، مگر ہر تنبیہہ ان کی سرکشی میں اضافہ ہی کئے جاتی ہے۔''

(۲) سورۃ الصافات کی آیات ۶۲ تا ۶۸:

﴿اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ۝ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ۝ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِىْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ۝ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ ۝ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ۝﴾

''بولو' یہ ضیافت اچھی ہے یا زقوم کا درخت؟ ہم نے اُس درخت کو ظالموں کے لئے فتنہ بنا دیا ہے۔ وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی تہہ سے نکلتا ہے۔ اُس کے شگوفے ایسے ہیں جیسے شیطانوں کے سر۔ جہنم کے لوگ اسے کھائیں گے اور اسی سے پیٹ بھریں گے۔ پھر اس پر پینے کے لئے اُن کو کھولتا ہوا پانی ملے گا' اور اس کے بعد اُن کی واپسی اُسی آتش دوزخ کی طرف ہوگی۔''

(۳) سورۃ الدخان کی آیات ۴۳ تا ۴۸:

﴿اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِیْمِ ۝ كَالْمُهْلِ ۚ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْیِ الْحَمِیْمِ ۝ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰی سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ ۝﴾

''زقوم کا درخت گناہ گار کا کھاجا ہوگا' تیل کی تلچھٹ جیسا' پیٹ میں وہ اس طرح جوش کھائے گا جیسے کھولتا ہوا پانی جوش کھاتا ہے۔ پکڑو اسے اور رگیدتے ہوئے لے جاؤ اس کو جہنم کے بیچوں بیچ' پھر انڈیل دو اس کے سر پر کھولتے پانی کا عذاب۔''

(۴) سورۃ الواقعہ کی آیات ۵۲ تا ۵۶:

﴿لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ۝ فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ۝ فَشٰرِبُوْنَ عَلَیْهِ مِنَ الْحَمِیْمِ ۝ فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِیْمِ ۝ هٰذَا نُزُلُهُمْ یَوْمَ الدِّیْنِ ۝﴾

''(اے گمراہو!) تم زقوم کے درخت کی غذا کھانے والے ہو۔ اُسی سے تم پیٹ بھرو گے اور اُوپر سے کھولتا ہوا پانی تونس لگے ہوئے اونٹ کی طرح پیو گے۔ یہ ہے ان کی ضیافت کا سامان روزِ جزا میں۔''

عربی زبان کی لغت ''المنجد'' میں زقوم کو گناہگاروں کے لئے جہنم کا درخت اور زہریلی غذا بتایا گیا ہے۔ اردو کی تفاسیر میں زقوم کو تھوہر کہا گیا ہے۔ مثلاً:

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' میں زقوم کو تھوہر کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ہندوستان کے ہر علاقے میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

''تفسیر حقانی'' میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے:

''شجر ملعونہ سے مراد زقوم کا پیڑ ہے۔ چونکہ قرآن مجید میں آ چکا تھا کہ یہ جہنمیوں کی غذا ہوگا' اس پر بھی قریش مکہ بہت تمسخر کیا کرتے تھے کہ آگ میں پیڑ ایک خلاف قیاس بات ہے' تو آپؐ (نعوذ باللہ) دیوانے ہیں' حالانکہ وہ پیڑ ہی آگ کا ہوگا' اور

یوں بھی آگ میں ایک کیڑا رہتا ہے جس کو سمندل کہتے ہیں۔ گویا نباتات کیا' بلکہ حیوانات بھی آگ میں ہوتے ہیں۔ یہ بھی ان کے لئے فتنہ ہوگیا' اور ملعونہ اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ بدمزا ہے۔ عرب بری چیز کو خبیث اور ملعون کہا کرتے ہیں۔''

مولانا عبدالماجد دریابادی اپنی ''تفسیر ماجدی'' میں زقوم کی شرح میں لکھتے ہیں:

''چنانچہ دورِ محمدی کی پہلی صدی کے بڑے روشن خیال ابوجہل نے ٹھیک آج کے روشن خیالوں کے انداز میں شجرِ زقوم کا ذکر سن کر تمسخر و استہزا کے لہجے میں کہا تھا کہ آگ کے شعلوں کے درمیان کوئی درخت کیسے رہ سکتا ہے؟ گویا عالمِ آخرت اور جہنم کے قوانین طبیعی بھی بالکل عالم ناسوت کے قوانین کی نقل ہوں گے..... زقوم ایک درخت ہے جو عرب میں اپنی تلخی کے لئے مشہور تھا۔ فارسی میں اسے حنظل اور اردو میں تھوہر کہتے ہیں۔ دوزخ میں آگ سے پیدا ہوگا' اور کسی طرح بھی انسانی غذا کے قابل نہ ہوگا۔ یوں بھی زہریلا اور تلخ ہوتا ہے' اور پھر دوزخ کے زقوم کا کہنا ہی کیا .....زقوم کے معنی کسی کسی نے یہ بھی بیان کئے ہیں کہ یہ قوم بربر کی زبان میں کھجور اور مکھن کو کہتے ہیں۔ اس پر فقہ مالکی کے مفسر ابن العربیؒ بڑے غصے کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ایسے قول کسی جاہل ہی کے ہو سکتے ہیں''۔

''روح المعانی'' میں صوفیہ کا یہ قول بھی نقل ہوا ہے کہ زقوم کا درخت حرص وحُبِّ دنیا کا درخت ہے جو حشر میں اس شکل میں متمثل ہو جائے گا۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اپنی تفسیر ''تفہیم القرآن'' میں سورۂ صافات کی متعلقہ آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''زقوم ایک قسم کا درخت ہے جو تہامہ کے علاقے میں ہوتا ہے۔ مزا اس کا تلخ ہوتا ہے' بونا گوار ہوتی ہے اور توڑنے پر اس میں سے دودھ کا سا رس نکلتا ہے جو اگر جسم کو لگ جائے تو ورم ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ وہی چیز ہے جسے ہمارے ملک میں تھوہر کہتے ہیں''۔

علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنے تفسیری حاشیے (نمبر ۲۲۵۰) میں لکھا ہے کہ زقوم کا پودا یروشلم کے قریب اریحہ میں پایا جاتا ہے۔ علامہ صاحب کا خیال ہے کہ قرآن مجید سے پہلے اس پودے کا نام کچھ اور ہوگا۔ نزول قرآن مجید کے بعد اس کا نام زقوم پڑ گیا۔

غرضیکہ اردو کے تمام مفسرین نے قرآن کریم کے لفظ ''زقوم'' کو تھوہر کے مماثل قرار دیا ہے۔ ''تھوہر'' کے بارے میں ''فرہنگ آصفیہ'' میں لکھا ہے: ''ہندی لفظ ہے۔ اسم مذکر ہے۔ ایک قسم کا خاردار زہریلا درخت' جس میں سے دودھ نکلتا ہے۔ زقونیا' زقوم۔ مزاجاً

تیسرے درجے میں گرم' دوسرے میں خشک۔ محلّل ریاح ومخرج اخلاطِ صفراوسوداوبلغم''۔

تھوہر کا تعلق نباتیات کی جنسِ آملہ سے ہے' جس کی ایک ہزار سے زیادہ انواع واقسام افریقہ اور ایشیا کے گرم خطوں' یہاں تک کہ امریکہ اور آسٹریلیا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ تمام اقسام ذائقے میں کڑوی اور کسیلی ہیں۔ بعض اقسام زہریلی ہیں۔ تمام اقسام میں اس کی ناگوار بوقدرِ مشترک ہے۔ ہندوستان' پاکستان میں جنسِ آملہ کی ساٹھ سے زیادہ اقسام پائی جاتی ہیں جو زیادہ تر خاردار ہیں۔ اس کو شمالی ہند میں تھوہر اور وسطی علاقوں میں سیندھ کہا جاتا ہے۔ جنسِ آملہ کی بعض اقسام عرب میں بھی ہیں۔ کہیں ان کو زقّوم کہا جاتا ہے' کہیں لبین اور کہیں رمید' اور بعض دوسرے نام بھی اسے دیئے گئے ہیں۔

نباتات کی اس جنس کا فنی نام Euphorbia کیوں پڑا' اس کا بھی ایک دلچسپ قصہ ہے۔ ماریطانیہ کا ایک بادشاہ جُوبا ثانی (۲۵ ق م تا ۱۸ عیسوی) تواریخ میں اس لئے مشہور ہے کہ اسے ملک کی نباتات اور جڑی بوٹیوں سے گہرا لگاؤ تھا' اور وہ ان کی جستجو میں رہتا تھا۔ ایک روز اسے ماریطانیہ کے پہاڑی علاقے میں ایک پودا ملا' جس کی جڑ سے ایسی سخت ناگوار اور زہریلی بو نکل رہی تھی کہ اُس کے قریب جاتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ اُس نے شاہی طبیب Euphorbus سے اس عجیب پودے کے خواص کے بارے میں گفتگو کی' اور اُسی کے نام پر اس کا نام Euphorbia رکھا' اور اس کے خواص کے بارے میں ایک کتابچہ بھی لکھوایا۔ اس میں تنبیہہ کی گئی کہ اس پودے کو چھونے سے جسم پر آبلے پڑ جاتے ہیں' جن سے پوری جلد میں سوزش ہونے لگتی ہے۔ اُس نے اس پودے کا دودھ بکروں کی کھال پر لگایا جو کچھ عرصے کے بعد سوکھ کر رال کی شکل کا ہو گیا۔ بادشاہ جُوبا ثانی کی اس دریافت کے بعد یہ یونانی اطباء کے علم میں آیا اور یونانی طبّ میں استعمال ہونے لگا۔ حکیم جالینوس (۱۳۰ء۔۲۰۰ء) نے مختلف عوارض کے معالجے میں زقّوم کا دودھ اور اس کی رال استعمال کی۔ حکیم جالینوس اور یونانی طبّ کی بنیاد پر عربوں نے اسے اپنی طبّ میں استعمال کیا اور اس کے لئے عربی زبان میں کئی نام رائج ہو گئے' مثلاً افربیون' فرفیون' فرفیوم۔ حکیم ابن سینا (۹۸۰ء۔۱۰۳۷ء) نے زقّوم کے دوائی استعمال وضاحت سے تحریر کئے اور ان امراض کا ذکر کیا' جن کے علاج میں اس کا استعمال مفید اور کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔

''ہمدرد فاؤنڈیشن'' کے زیرِ اہتمام اور حکیم محمد سعید شہید کے زیرِ ادارت طبع شدہ کتاب ''دیہاتی معالج'' میں تھوہر کے طبی فوائد واستعمالات پر اچھی خاصی تفصیل درج

ہے۔ لکھا ہے کہ:

''تھوہر ایک کانٹوں دار پودا ہے جس کو باغوں اور کھیتوں کی حفاظت کے لئے ان کے اردگرد خندقوں پر لگاتے ہیں۔ اس کے تنے اور شاخوں پر تیز کانٹے ہوتے ہیں۔ پتے کتے کی زبان جیسے ہوتے ہیں۔ اس کا کوئی پتا یا شاخ توڑی جائے یا تنے میں شگاف دیا جائے تو اس سے دودھ بہنے لگتا ہے۔ تھوہر کئی قسم کی ہوتی ہے' لیکن ہمارے ہاں اس سے عام طور پر ''ڈنڈا تھوہر'' مراد ہوتی ہے۔ ڈنڈا تھوہر کی شاخیں اور تنا گول ہوتا ہے' لیکن اس کی دوسری قسمیں مثلاً تدھارا میں تنا تکونا اور چودھارا تھوہر کا تنا چارکونا ہوتا ہے''۔

تھوہر دواؤں میں بہت کام آتا ہے۔ خصوصاً اس کا دودھ بڑے کام کی چیز ہے۔ یہ دست آور دوا ہے۔ آتشک' گٹھیا' جذام اور پرانی بلغمی کھانسی میں بہت فائدہ دیتا ہے۔ تھوہر سے تیل بھی بنایا جاتا ہے جو گٹھیا اور فالج کے لئے نہایت مفید ہے۔ اگر داڑھ میں درد ہو تو تھوہر کا دودھ ایک قطرہ احتیاط سے اس پر لگائیں تو درد دور ہو جاتا ہے اور اس داڑھ کو آسانی سے اکھاڑا جا سکتا ہے۔ تھوہر کا دودھ داد' چنبل پر لگانے سے اس کو بہت جلد اچھا کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ داد' چنبل کے لئے اس کا مرہم بھی بنایا جاتا ہے' جس کے لگانے سے یہ بہت جلد دور ہو جاتے ہیں۔

اللہ کی شان کہ جس پودے کی زہریلی کڑواہٹ اور ناگوار بُو کو آخرت میں گناہگاروں کی غذا قرار دیا گیا ہے' اس پودے میں دوائی عناصر بھی پوشیدہ رکھ دیئے۔ جائے عبرت بھی' سبق آموز بھی!

محترم صدر مؤسس کا دورۂ بھارت

گزشتہ شمارہ کے ''حرفِ اوّل'' میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدر مؤسس محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کے حالیہ دورۂ بھارت کا تذکرہ کیا گیا تھا اور اس دورے کی ایک مختصر رپورٹ حکمت قرآن میں شائع کرنے کا عندیہ ظاہر کیا گیا تھا۔ اتوار ۲ر جنوری کو محترم صدر مؤسس نے قرآن آڈیٹوریم لاہور میں اپنے حالیہ دورۂ بھارت کے مشاہدات و تاثرات قدرے تفصیل سے بیان فرمائے' جنہیں مرتب کر کے ماہنامہ میثاق میں شائع کر دیا گیا ہے۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات میثاق کا تازہ شمارہ (فروری ۰۵ء) ملاحظہ فرمالیں۔

نیک مقاصد کے لئے دولت کی طلب

مدرس : پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ رَجُلٍ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ :کُنَّا فِیْ مَجْلِسٍ فَطَلَعَ عَلَیْنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ وَعَلٰی رَاْسِہٖ اَثَرُ مَاءٍ ، فَقُلْنَا :یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ نَرَاکَ طَیِّبَ النَّفْسِ، قَالَ :اَجَلْ، قَالَ :ثُمَّ خَاضَ الْقَوْمُ فِیْ ذِکْرِ الْغِنٰی، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :((لَا بَاْسَ بِالْغِنٰی لِمَنِ اتَّقَی اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ، وَالصِّحَّۃُ لِمَنِ اتَّقٰی خَیْرٌ مِنَ الْغِنٰی ، وَطِیْبُ النَّفْسِ مِنَ النَّعِیْمِ)) [مسند احمد]

رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی سے روایت ہے کہ ہم چند آدمی ایک مجلس میں بیٹھے تھے، آنحضرت ﷺ بھی وہیں ہمارے پاس تشریف لے آئے، اور آپ کے سر مبارک پر اُس وقت پانی کا اثر تھا (یعنی معلوم ہوتا تھا کہ آپ نے ابھی غسل فرمایا ہے) تو ہم میں سے کسی نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت حضور کا مزاج بہت اچھا، اور دل بہت خوش ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''ہاں! (الحمد للہ ایسا ہی ہے) پھر اہل مجلس دولت مندی اور دنیوی خوشحالی کا کچھ تذکرہ کرنے لگے (کہ وہ اچھی چیز ہے یا بری، اور دین اور آخرت کے لئے مضر ہے یا مفید؟) تو آپ نے اس سلسلہ میں ارشاد فرمایا: ''جو شخص اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرے (اور اس کے احکام کی پابندی کرے) اس کے لئے مالداری میں کوئی مضائقہ اور حرج نہیں، اور صحت مندی صاحب تقویٰ کے لئے دولت مندی سے بھی بہتر ہے، اور خوش دلی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے (جس کا شکر واجب ہے)''۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر بسایا تو ضروریاتِ زندگی کی ہر چیز کا انتظام بھی کر دیا۔ چنانچہ انسان طرح طرح کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ انسانی کمزوریاں بہرحال انسان کے ساتھ ہیں۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ دنیاوی نعمتوں اور مال و دولت کی فراوانی میں منہمک ہو کر انسان اپنے مقصدِ حیات کو فراموش کر دیتا ہے۔ مال و دولت کی کثرت اسے عیش و عشرت کا

دلدادہ بنا دیتی ہے۔ وہ طرح طرح کے منکرات وفواحش میں مبتلا ہو کر گمراہی میں پڑ جاتا ہے۔ اسی سبب سے عام طور پر مال و دولت کی فراوانی کو اچھا نہیں سمجھا جاتا کیونکہ دولت مند آدمی کے لئے گناہوں کا ارتکاب آسان ہو جاتا ہے۔ مگر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اچھا اور برا پہلو تو ہر جگہ موجود ہے۔ یہ زندگی تو سراسر آزمائش ہے کہ دیکھیں کون اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا صحیح استعمال کرتا ہے۔ دولت بھی دوسری نعمتوں کی طرح ایک نعمت ہے' جہاں اس کا برا استعمال ضلالت و گمراہی کی طرف لے جاتا ہے وہاں اس کے جائز استعمال سے بے شمار نیکیاں کمائی جا سکتی ہیں۔ بنیادی طور پر مال و دولت کوئی بری چیز نہیں ہے۔ قرآن مجید میں بار ہا مال کے لئے خیر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ چند مقامات ملاحظہ کیجئے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴾ (البقرة)

''فرض کیا گیا ہے تم پر جب قریب آ جائے تم میں سے کسی کے موت بشرطیکہ چھوڑے کچھ مال کہ وصیت کرے اپنے ماں باپ کے لئے اور قریبی رشتہ داروں کے لئے انصاف کے ساتھ۔''

اور:

﴿يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۖ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴾ (البقرة)

''آپ سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں۔ آپ فرمائیے جو کچھ خرچ کرو (اپنے) مال سے تو اس کے مستحق تمہارے ماں باپ ہیں اور قریبی رشتہ دار ہیں اور یتیم ہیں اور مسکین ہیں اور مسافر ہیں۔ اور جو نیکی تم کرتے ہو تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔''

اور

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۗ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلِأَنْفُسِكُمْ ۚ وَمَا تُنْفِقُونَ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۚ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ۝ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ ۖ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ

تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۗ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ (البقرۃ)

''نہیں ہے آپ کے ذمہ ان کو سیدھی راہ پر چلانا' ہاں اللہ سیدھی راہ پر چلاتا ہے جسے چاہتا ہے' اور جو کچھ تم خرچ کرو (اپنے) مال سے تو (اس میں) تمہارا اپنا فائدہ ہے' اور تم تو خرچ ہی نہیں کرتے ہو سوائے اللہ کی رضا طلبی کے' اور جتنا کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پورا ادا کر دیا جائے گا تمہیں اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (خیرات) ان فقیروں کے لئے ہے جو روکے گئے ہیں اللہ کی راہ میں' نہیں فرصت ملتی انہیں (روزی کمانے کے لئے) چلنے پھرنے کی زمین میں' خیال کرتا ہے انہیں ناواقف (کہ یہ) مالدار (ہیں) بوجہ ان کے سوال نہ کرنے کے۔ (اے حبیب!) آپ پہچانتے ہیں انہیں ان کی صورت سے' یہ نہیں مانگا کرتے لوگوں سے لپٹ کر' اور جو کچھ تم خرچ کرو گے (اپنے) مال سے پس یقیناً اللہ تعالیٰ اسے خوب جاننے والا ہے۔''

اور:

﴿وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴿۸﴾﴾ (العٰدیٰت)

''اور یقیناً انسان مال کی محبت میں بہت پکا ہے۔''

''خیر'' ہی کا لفظ نیکی اور بھلائی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یوں اس لفظ کے معنی اور مفہوم میں برائی کا عنصر کسی طرح بھی شامل نہیں۔ ہاں یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ مال کی آزمائش پر پورا اترنا مشکل ہے' اسی لئے عام طور پر اس کو اچھی چیز نہیں سمجھا جاتا۔

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ اگر کسی شخص کو مال و دولت ملے اور وہ شخص متقی اور پرہیزگار ہو' یعنی اپنے مال کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں استعمال کرے تو اس طرح کے مال و دولت میں کوئی خرابی نہیں۔ اسی طرح اپنی ضروریات کے لئے اور صدقہ و خیرات اور بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کے لئے اگر دولت کی تمنا کی جائے تو یہ بھی اچھی بات ہے۔ قرآن مجید میں دنیاوی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی قطعاً ممانعت نہیں ہے۔ سورۃ الاعراف آیت ۳۲ میں ارشاد ہے: ﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ﴾ ''کہہ دیجئے کس نے حرام کیا اللہ کی زینت کو جو اس نے پیدا کی اپنے بندوں کے واسطے اور ستھری چیزیں کھانے کی''۔ پس دنیاوی نعمتوں کی تمنا کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا ہرگز بری بات نہیں۔ البتہ ان نعمتوں سے

ناجائز فائدہ اٹھانا' اللہ تعالیٰ کو فراموش کر کے کبر ونخوت میں مبتلا ہو کر گناہوں پر دلیر ہو جانا سراسر گمراہی' گھاٹے کا سودا اور عاقبت کی بربادی کا سبب ہے۔ حضرت ابو ہریرہ ؓ سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص دنیا کی دولت جائز طریقے سے اس مقصد کے لئے حاصل کرنا چاہے تاکہ اس کو دوسروں سے سوال نہ کرنا پڑے اور اپنے اہل وعیال کے لئے روزی اور آرام وآسائش کا سامان مہیا کر سکے اور اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بھی وہ احسان اور بھلائی کر سکے تو قیامت کے دن وہ اللہ کے حضور اس حال میں حاضر ہوگا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن اور چمکتا ہوگا''۔

اس سے معلوم ہوا کہ صحیح مصرف کی خاطر دنیا کا مال طلب کرنا نہ صرف جائز بلکہ بہت بڑا کارِ ثواب ہے جس کے نتیجہ میں روزِ حساب اسے امتیازی شان نصیب ہوگی۔ اس کے برعکس خدا کی دی ہوئی نعمت مال و دولت کو' خواہ وہ حلال ذرائع سے ہی کمائی گئی ہو' فضول خرچیوں' عیش پرستیوں' نمود ونمائش' ناجائز کاموں اور نافرمانیوں میں خرچ کرنے والا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کا نشانہ بنے گا۔

اس حدیث کی توضیح میں مولانا محمد منظور نعمانی ؒ لکھتے ہیں کہ ''دولت مندی اور مال داری اگر تقویٰ کے ساتھ ہو یعنی اللہ کا خوف' آخرت کی فکر اور احکامِ شریعت کی پابندی نصیب ہو تو اس میں دین کا کوئی خطرہ نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ اگر توفیق دے تو اس صورت میں یہی مال و دولت دین کی بڑی سے بڑی ترقیوں اور جنت کے اعلیٰ درجوں تک پہنچنے کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ حضرت عثمان ؓ کے مناقب وامتیازات میں کافی حصہ ان کے اس مال و دولت ہی کا ہے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں بے دریغ اور بے حساب خرچ کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے ہی موقعوں پر ان کے حق میں بڑی بڑی بشارتیں سنائی تھیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ دولت مندی کے ساتھ تقویٰ یعنی خدا ترسی اور فکرِ آخرت اور اتباعِ شریعت کی توفیق کم ہی لوگوں کو ملتی ہے' ورنہ دولت کے نشہ میں اکثر لوگ بہک ہی جاتے ہیں''۔

پس جہاں مال و دولت کے ساتھ گناہ اور معصیت کے کام آسانی سے کئے جا سکتے ہیں وہاں خدا کی خوشنودی والے کام کر کے ثواب بھی کمایا جا سکتا ہے۔ دیکھئے مال دار مسلمان زکوٰۃ ادا کر کے کتنے مفلوک الحال افراد کی مدد کر سکتا ہے۔ حج کی سعادت اسی کو نصیب ہوگی جس کے پاس مالی استطاعت ہوگی اور حج وہ نیکی ہے کہ انسان کو گناہوں سے پاک کر دیتی ہے۔ الغرض دولت فی نفسہٖ خیر ہے' البتہ اس کا غلط استعمال اسے شر بنا دیتا ہے۔

اس حدیث میں حلال ذرائع سے نیک مقاصد کے لئے دولت طلب کرنے کو مستحسن کہا گیا ہے۔ اسی طرح صحت جسمانی کی قدر و قیمت کا بھی احساس دلایا گیا ہے کہ یہ انمول نعمت ہے' بلکہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت تندرستی ہی ہے۔ تندرستی کے لئے ہمہ وقت اللہ سے دعا کرنی چاہئے اور شکر گزاری کے طور پر صحت مندی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دین کی سربلندی کی جدوجہد' بیماروں کی امداد محتاجوں کی خبر گیری اور رفاہ عامہ کے کاموں میں بھرپور حصہ لینا چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ''خوش دلی بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ہے''۔ پس جہاں مال و دولت' خوشحالی اور صحت کی تمنا اور آرزو کی جائے وہاں خوش دلی کے لئے بھی دعا کرنا چاہئے۔

بقیہ: حرفِ اول

گذشتہ تین برسوں سے اب یہ فیصلہ شریعت کورٹ کے سرد خانے کی زینت ہے۔ بدقسمتی سے اُمت مرحوم کی قسمت دو بُرے انجاموں کے مابین معلق نظر آتی ہے..... الّا یہ کہ رحمت خداوندی ہی ہماری دستگیری فرمالے! ایک انجام اُن تاخیری حربوں کی صورت میں ہے جو اللہ کے خلاف جنگ کا چیلنج قبول کرنے پر ہر روز ایک نئی افتاد کی مانند ہماری پیٹھوں پر برستا ہے۔ ملک کو لاحق داخلی اور خارجی خدشات اُس جاری جنگ کے نتائج کا محض ایک پرتو ہیں۔ اصل انجام کو زباں پر لانے سے ہی کپکپی طاری ہوتی ہے۔ دوسرا متوقع انجام اُس جیسا ممکنہ المیہ ہے جو ۲۰۰۲ء میں پی سی او پر حلف اُٹھائی ہوئی کورٹ کے ہاتھوں کمال ہوشیاری سے انجام پذیر ہوا تھا۔ یعنی..... خاکم بدہن..... کہیں یہی کھیل فیڈرل شریعت کورٹ میں بھی نہ کھیل دیا جائے اور یہ کانٹا ہمیشہ کے لئے ہی نہ نکال دیا جائے۔ اس صورت حال میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ ''وقت دعا'' ہے۔ ہر ہوش مند اور باشعور شخص کو معاملے کی نزاکت پہچان کر دعا کے ساتھ ساتھ اس کام کے لئے اپنا اپنا کردار ادا کرنا چاہئے!

مؤرخہ ۱۶'۱۷ فروری ۲۰۰۵ء کو بعد نماز مغرب قرآن آڈیٹوریم میں ہونے والے سیمینار' بعنوان ''اسلام اور بینکنگ'' کا ہدف اور محرک بھی یہی ہے کہ موضوع کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں عمومی آگہی پیدا کی جائے۔ دلچسپی رکھنے والے افراد کے لئے یہ سیمینار علم و آگہی کا ایک بہترین ذریعہ ثابت ہوگا' ان شاء اللہ!

اسلام اور انسانی حقوق

تحریر: سید جلال الدین عمری

انسانی حقوق کے بارے میں یہ تصور دیا جاتا ہے کہ اس کا احساس جیسے آج ہے' اس سے پہلے نہیں تھا اور انسانوں کی اکثریت انسانی حقوق سے محروم تھی اور ظلم کی چکی میں پس رہی تھی۔ کبھی کہیں سے کوئی آواز اٹھتی بھی تو طاقت ور طبقات کی طاقت کے نیچے دب جاتی۔ اس کی آزادی کا صحیح معنوں میں احساس مغرب کو ہوا اور مغرب ہی نے اس کا واضح تصور دیا۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس کے الفانسو شاہ نہم نے یہ قانون منظور کیا یا اس سے منظور کرایا گیا کہ کسی کو بلاوجہ قید نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے لفظوں میں حبسِ بے جا کو کالعدم قرار دیا گیا۔ اسے انسانی حقوق کی تاریخ میں بہت بڑا اقدام سمجھا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد فرانس ہی میں روسو پیدا ہوا' اس کی کتاب کا اور اس نے انسانی آزادی کا جو تصور دیا اس کا بڑا چرچا رہا۔ اس نے کہا انسان فطرتاً آزاد ہے اور اسے آزاد ہونا چاہئے۔ اس کتاب کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوا اور بڑی انقلابی کتاب سمجھی گئی۔ اردو زبان میں بھی اس کا ترجمہ موجود ہے۔ اس کتاب کے بعد فرانس میں ایک طرح کی ہلچل پیدا ہوئی اور (Declaration of Rights of Man) نامی اعلانیہ شائع ہوا' جس میں انسانی حقوق کا تذکرہ تھا۔ پھر اس کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء میں اقوام متحدہ نے حقوقِ انسانی کا عالمی منشور (The Universal Declaration of Human Rights) شائع کیا۔ اسے اس سلسلے کا بڑا انقلابی قدم سمجھا جاتا ہے اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انسانی حقوق کا بہت ہی صاف اور واضح تصور اس کے اندر موجود ہے اور انسانوں کو ظلم و زیادتی سے بچانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

اس منشور میں جن باتوں پر زور دیا گیا ہے وہ ہیں: فرد کی آزادی' عدل و انصاف اور مساوات۔ قانون کے ماہرین کے نزدیک یہ اس اعلانیے کی بنیادی خصوصیات ہیں اور یہ چیزیں اگر انسان کو مل جائیں تو اس کے حقوق محفوظ ہو جاتے ہیں۔

اس منشور میں بعض خامیاں بھی ہیں اور عملی رکاوٹ بھی ہے۔ ایک یہ کہ یہ منشور منظور تو

ہو گیا' لیکن اس کے پیچھے کوئی قوتِ نافذہ نہیں ہے۔ اگر کوئی ملک خاص طور پر کوئی طاقت ور ملک اس کی خلاف ورزی کرے تو اسے اس کا پابند بنانے کی کوئی ٹھوس اور مؤثر تدبیر اس میں تجویز نہیں کی گئی ہے۔ اس کا ثبوت آپ آج کی دنیا میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک بڑا ملک اپنی طاقت کے زعم میں پوری دیدہ دلیری کے ساتھ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور کوئی اسے روکنے والا نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں مذہبی آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے' لیکن اس آزادی کے صحیح معنوں میں حدود متعین نہیں ہوئے ہیں۔ فرض کیجئے کہ اگر مذہبی آزادی کا تصور صرف یہ ہے کہ آدمی پوجا پاٹ کرے' عبادت گھر میں جا کے اللہ کی عبادت کرے' مسجد میں نماز پڑھ لے' چرچ میں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کر لے' گردوارے میں چلا جائے یا جس کی جو عبادت گاہ ہے اس میں پہنچ جائے اور عبادات کے مراسم ادا کر لے تو یہ بھی ایک آزادی ہے۔ اس سے آگے کچھ خاص معاملات میں آزادی دے کر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مذہبی آزادی ہے۔ لیکن اسلام کے معاملے میں مشکل یہ ہے کہ اسلام پوری زندگی کے بارے میں ہمیں ہدایات دیتا ہے اور ایسا کوئی دستور نہیں ہے جو یہ کہے کہ (ایک سکولر ملک میں) مسلمانوں کو اپنے مذہب کے تمام احکام پر چلنے کی آزادی ہے' وہ اپنے دائرے میں اپنا قانون نافذ کر سکتے ہیں۔

تیسری بات یہ کہ مغرب میں چرچ اور اہل مغرب نے اور ان کے زیر اثر برسر اقتدار طبقہ نے انسان کی آزادی فکر و عمل اور اس کے بنیادی حقوق کے سلسلے میں انتہائی غلط رویہ اختیار کیا جس کا صحیح مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کے ردعمل میں حقوق انسانی کا موجودہ تصور ابھرا۔ اس میں مذہب کے حقیقی رول کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اللہ کے جو پیغمبر دنیا میں آئے ان کی کیا تعلیمات رہی ہیں' ان کو جب اقتدار ملا تو ان کا کیا رویہ رہا ہے اور انسانیت کس طرح فلاح سے ہمکنار ہوئی ہے؟ یہ چیز کہیں زیر بحث آتی ہی نہیں۔ جیسے یہ طے کر لیا گیا ہو کہ مذہب سے ہٹ کر یا مذہب کو نظر انداز کر کے گفتگو کی جائے گی۔ ظاہر ہے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی معروضی یا غیر جانبدارانہ مطالعہ ہے' بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ جانب دارانہ مطالعہ ہے جس میں پہلے سے طے کر لیا گیا ہے کہ مذہب کا حقیقی کردار زیر بحث نہیں آئے گا' بلکہ اسے نظر انداز کیا جائے گا۔

یہ ایک واقعہ ہے اور اسلام اسے تسلیم کرتا ہے کہ انسانوں پر ظلم و زیادتی ہوتی رہی ہے

اور آدم علیہ السلام کے پہلے ہی بیٹے نے ظلم و زیادتی کی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ کے پیغمبر جن مقاصد کو لے کر دنیا میں آتے ہیں ان میں ایک بنیادی مقصد زمین پر عدل و انصاف کا قیام اور ظلم کا خاتمہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کو انہوں نے دنیا میں عام کرنے اور پھیلانے کی کوشش بھی کی اور جب کبھی انہیں اقتدار ملا تو عدل و انصاف سے دنیا بھر گئی۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے' تاریخ کے ایک طویل عرصے تک اس کی فرماں روائی رہی ہے' اس کے قوانین متمدن دنیا کے بڑے حصے میں نافذ رہے ہیں۔ ان قوانین کا مطالعہ صاف بتاتا ہے کہ یہ قوانین عدل و انصاف کے تقاضے ہر پہلو سے پورے کرتے ہیں اور ان میں وہ تمام حقوق انسانوں کو دیئے گئے ہیں جن کا آج تذکرہ کیا جاتا ہے۔ لیکن جب کبھی اسلام کا ذکر آتا ہے تو ایک تو صحیح معنوں میں اس کے رول کو تسلیم نہیں کیا جاتا' دوسرے یہ کہا جاتا ہے کہ آج کا جو معیارِ فکر و نظر ہے' یا آج انسان تہذیبی و تمدنی لحاظ سے جہاں پہنچ چکا ہے اور جو اس کے تقاضے ہیں' اسلامی تعلیمات اس سے کم تر درجے کی ہیں۔ وہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا اور عدل و انصاف کا جو اعلیٰ معیار ہونا چاہئے اس نے بہت سے معاملات میں وہ معیار قائم نہیں رکھا ہے۔

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اسلام ان حقوق کی حفاظت کرتا ہے' اس لئے کہ اسلام ہی کے نام پر ظلم و زیادتی اور دہشت گردی ہو رہی ہے' لوگوں کا خون بہایا جا رہا ہے اور جو لوگ یہ کام کر رہے ہیں وہ اسلام ہی کے حوالے سے کر رہے ہیں' پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام عدل و انصاف اور انسانی حقوق کا محافظ ہے؟ صحیح بات یہ ہے کہ کہیں فی الواقع ظلم ہو رہا ہے یا دہشت گردی پائی جاتی ہے تو اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام حقوق انسانی کا پاسبان بن کر آیا ہے' اگر کوئی فرد یا گروہ انہیں پامال کر رہا ہے تو اسے اسلام کی سند ہرگز حاصل نہیں ہوگی۔ اسلام نے انسان کو وہ تمام حقوق دیئے ہیں اور ان کی حفاظت کا جذبہ پیدا کیا ہے جن کا آج دنیا میں چرچا ہے اور اس سے بہت مشکل حالات میں اس نے یہ حقوق دیئے ہیں۔ قرآن یا احادیث میں ان حقوق کا قانون کی زبان میں بیان کم ہوا ہے۔ قانون کی کتابوں میں جس طرح قوانین دفعہ وار لکھے جاتے ہیں کہ پہلی دفعہ یہ ہے' دوسری یہ ہے اور تیسری یہ ہے' اس طرح قرآن و حدیث میں قانون بیان نہیں ہوا ہے' بلکہ اس نے اپنی تعلیمات کے ضمن میں ان قوانین کا حوالہ دیا ہے کہ ان حالات میں یہ قانون ہے۔ اس نے بالعموم کسی قانون کا ایک ہی جگہ ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس کے ایک پہلو کا ایک جگہ ذکر ہے تو دوسرے پہلو کا دوسری جگہ۔ کچھ اور پہلو تیسری جگہ زیر بحث آئے ہیں۔ ان سب کو

ملانے سے جو تصویر بنتی ہے وہ اہم ہے' اور پھر احادیث میں ان کی تفصیلات ملتی ہیں۔ اس کے ساتھ اسلامی قانون پر ہمارے علماء وفقہاء نے بڑا زبردست کام کیا ہے۔ ان کی قانونی وفقہی بصیرت کو صحیح بات یہ ہے کہ کوئی نادان ہی چیلنج کر سکتا ہے۔ جس باریک بینی کے ساتھ انہوں نے قانون کا مطالعہ کیا اور تحقیق کی ہے غالباً دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ ایک ایک لفظ اور عبارت کے ایک ایک پہلو پر ان کے جو ڈسکشن موجود ہیں اور جس باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے اس سے قوانین کے متعین گوشے سامنے آتے ہیں اور قانون کی ایک تصویر بنتی ہے۔ اسی تصویر کو سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔

اسلام نے انسان کو جو حقوق دیئے ہیں ان پر گفتگو سے پہلے یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اس کائنات اور انسان کے بارے میں اس کا ایک خاص نقطۂ نظر ہے۔ اس کی بنیادی اہمیت ہے۔ اس کی بعض اصولی تعلیمات ہیں' جن سے وہ کسی قیمت پر ہٹتا نہیں ہے اور اس کا کوئی قانون ان تعلیمات سے ٹکراتا نہیں ہے۔ اگر آپ کوئی قانون بنائیں یا جاری کریں تو آپ کو اس بات کا خیال رکھنا پڑے گا کہ وہ ان بنیادی تعلیمات سے نہ ٹکرائے۔ اگر وہ ان بنیادی تعلیمات سے ٹکرائے گا تو وہ اسلامی قانون نہیں ہوگا۔ مثال کے طور پر قرآن کہتا ہے کہ اس دنیا کا خالق و مالک اللہ ہے۔ ہر چیز اس کی ملکیت ہے' یہ اس کا ایک بنیادی تصور ہے۔ اس تصور نے ہر ظالم اور ہر جابر کا اقتدار ختم کر دیا ہے اور اسے بتا دیا ہے کہ تم مالک نہیں ہو' مالک تو اللہ ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کو اس حیثیت سے تسلیم کرتا ہے تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس اقتدار ہے اور میں بادشاہ ہوں' میں کسی بڑی جائیداد اور پراپرٹی کا مالک ہوں یا لینڈ لارڈ ہوں' یا میری کوئی اور حیثیت ہے یا میں کوئی صنعت کار ہوں' اس لئے جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ جب اصل مالک اللہ ہے تو انسان اس کی ملکیت میں اس کی مرضی ہی کے مطابق تصرف کر سکتا ہے۔ اللہ کی عطا کردہ قوت و طاقت و وسائل و ذرائع کو اس کی مرضی کے خلاف اس کے بندوں پر ظلم و زیادتی کے لئے استعمال نہیں کر سکتا۔ ایک اور مثال لیجئے۔ وہ کہتا ہے کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ ایک بنیادی تصور ہے اور جب تک اللہ چاہتا ہے انسان دنیا میں زندہ رہتا ہے۔ بعض بچے ماں کے پیٹ ہی میں مر جاتے ہیں۔ کوئی پیدا ہوتے ہی مر جاتا ہے۔ کوئی جوان ہو کر مرتا ہے' کوئی بوڑھا ہو کر مرتا ہے۔ یہ فیصلہ کرنا کہ کوئی آدمی اس دنیا میں کب تک زندہ رہے گا' یہ اللہ کا کام ہے۔ اس سے زندگی تم نہیں سلب کر سکتے' اور اگر کرو گے تو اللہ کے اقتدار میں دخل دو گے اور اس کی سزا پاؤ گے۔ اسی طرح وہ کہتا ہے کہ

انسان صرف خدا کا بندہ بن جائے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اس میں اس بات کا اعلان ہے کہ انسان پر حکومت صرف اللہ کی ہے اور کسی دوسرے کو اسے غلام بنانے کا حق نہیں ہے اور ہر اقتدار کو اللہ کے اقتدار کے تابع ہونا چاہئے۔ اس سے آزاد ہو کر کسی انسان پر دوسرے انسان کا نہ تو سیاسی اقتدار جائز ہے اور نہ مذہبی اقتدار۔ اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ انسان محترم ہے۔ اس کے احترام کے بہت سے پہلو ہیں۔ اسے اس کے فطری حقوق سے محروم کرنا اس کے احترام کے منافی ہے۔ اگر انسان کو ذلیل کیا گیا تو وہ محترم نہیں رہا' ذلیل ہوا۔ قرآن اس کے خلاف ہے۔ اس طرح اس نے کچھ بنیادی تصورات دیئے ہیں۔ دنیا کے ہر دستور میں تمہیدی باتیں ہوتی ہیں یا رہنما اصول ہوتے ہیں۔ اسلام کے ان بنیادی تصورات کو آپ راہنما اصول کہہ سکتے ہیں۔ ان سے انسانی حقوق کا متعین تصور ابھرتا ہے اور انہیں ایک رُخ ملتا ہے۔ اسلام کے نزدیک قانون دینے کا حق صرف اللہ کو ہے اور انسان اس قانون کا پابند ہے۔ ہاں اس کے عطا کردہ قانون کی روشنی میں وہ حالات کے لحاظ سے اجتہاد کر سکتا ہے۔ کسی کو فرماں روائے مطلق بننے کی اجازت نہیں ہے۔ اللہ کے قانون کے تحت بڑے سے بڑا حاکم اور محکوم دونوں زندگی گزار سکتے ہیں۔ اسلام نے صرف قانون ہی نہیں دیا ہے بلکہ وہ آگاہ کرتا ہے کہ اگر اس قانون پر عمل نہ ہو تو اللہ کے یہاں پکڑ ہوگی۔ وہ آخرت کا خوف پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے اس قانون پر انسان کے لئے عمل کرنا نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ اگر آخرت پر اس کا یقین ہے تو وہ اللہ کے قانون کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔

حقوق کئی طرح کے بیان کئے جاتے ہیں۔ ایک تو انسان کے شخصی اور ذاتی حقوق ہیں۔ انسان ہے تو اسے کچھ حقوق لازماً چاہئیں۔ ایک حق تو یہ ہے کہ اسے زندہ رہنے دیا جائے۔ کوئی شخص اگر قرآن مجید صرف سرسری انداز میں بھی پڑھے' تو اسے معلوم ہوگا کہ قرآن نے اس حق کو کتنی اہمیت دی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہر انسان جو پیدا ہوتا ہے اسے زندہ رہنے کا حق ہے اور جو لوگ اس کے اس حق کو پامال کر رہے تھے اس نے ان کے خلاف آواز بلند کی۔ جو لوگ کسی بھی وجہ سے' معاشی وجہ سے' شرم و حیا کے خیال سے یا مذہبی نقطۂ نظر سے انسان کی جان کا احترام نہیں کر رہے تھے قرآن نے ان کو چیلنج کیا۔ اس نے کہا کہ کسی کو کسی کی زندگی چھیننے کا حق ہی حاصل نہیں ہے۔ یہ بات اتنی وضاحت اور اتنے مختلف طریقوں سے کہی گئی ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے قرآن انسان کی زندگی کا سب سے بڑا وکیل ہے۔ قانون کے ماہرین کہتے ہیں کہ کوئی حق مطلق نہیں ہوتا' اس میں استثناء بھی ہوتا ہے' اس کے ساتھ شرائط

بھی ہوتی ہیں۔ یہ بات بھی قرآن ہی نے واضح کی ہے کہ کوئی حق مطلق نہیں ہے اور کسی حق کے بارے میں آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بالکل (absolute) ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسانی جان محترم ہے لیکن کبھی وہ اپنا احترام کھو دے گی اور انسان کا حقِ حیات ختم ہو جائے گا' بشرطیکہ حق وانصاف اس کا تقاضا کرتے ہوں۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ ''وہ انسانی جان کو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے' قتل نہیں کرتے' مگر حق کے ساتھ''۔ مطلب یہ کہ حق وانصاف کا تقاضا ہو تو اللہ کے بندے انسانی جان لے سکتے ہیں۔ لیکن اگر حق وانصاف اجازت نہ دے تو کسی بھی شخص کو خواہ وہ وقت کا بادشاہ اور مملکت کا فرماں روا ہی کیوں نہ ہو' یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ کسی کو اس کے زندہ رہنے کے حق سے محروم کر دے۔

انسانی حقوق پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں مساوات کو تمام حقوق کی اساس قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی تصور سے تمام حقوق نکلتے ہیں کہ سارے انسان مساوی حیثیت کے مالک ہیں۔ ان میں عورت' مرد' بڑے' چھوٹے' امیر' غریب' مالک اور مزدور سب کا درجہ ایک ہے۔ ان میں رنگ ونسل' وطن' علاقے' جنس اور صنف کی بنا پر کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ آواز جتنے زوردار طریقے سے اسلام نے اٹھائی اور نبی ﷺ نے اسے بیان کیا' اس سے زوردار آواز اٹھائی نہیں جا سکتی۔ قرآن کی آیات اس سلسلے میں معروف ہیں۔ حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ نے جو بے نظیر خطبہ دیا' جسے اسلامی حقوق کا منشور کہا جا سکتا ہے' اگر اسے آپ حقوق انسانی کا اوّلین منشور کہیں تو بے جا نہ ہوگا' اس میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى))

مطلب یہ کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اس میں آپؐ نے سب سے پہلے عربی کا ذکر کیا ہے۔ عربوں کے ذریعے اسلامی انقلاب آیا تھا۔ عرب اس وقت تختِ حکومت پر فائز اور فرماں رواں تھے۔ ان سے کہا گیا کہ یاد رکھو کسی عربی کو کسی عجمی پر فوقیت نہیں ہے اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ ہاں' اگر کسی کے پاس تقویٰ ہے تو وہ افضل ہے' اس کا احترام ضرور ہونا چاہئے' سوسائٹی میں اس کی عزت ہونی چاہئے۔ اس کی جگہ یہ دیکھنا کہ کون گورا ہے' کون کالا ہے' کون عربی ہے' کون عجمی ہے اور کس کا کس ملک سے تعلق ہے اور کون مرد ہے اور کون عورت ہے' ناجائز اور غیر اسلامی رویہ ہے۔ یہ اعلان اس وقت کیا

گیا جب دنیا مساوات کا واضح تصور نہیں رکھتی تھی۔

انسان کا ایک بنیادی حق یہ مانا جاتا ہے کہ اسے عدل و انصاف حاصل ہو۔ اس معاملہ میں اسلام کا موقف بالکل واضح ہے۔ قرآن و حدیث میں یہ بات پورے زور اور قوت کے ساتھ کہی گئی ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کے ساتھ بے لاگ عدل و انصاف کا معاملہ کیا جائے۔ وہ عدل وقسط کے قیام کو اللہ کے رسولوں کی بعثت کا ایک اہم مقصد قرار دیتا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ﴿ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ﴾ مطلب یہ کہ ہم نے رسولوں کو بھیجا کھلی کھلی دلیلیں دے کر اور ان پر ہم نے کتابیں نازل کیں اور انصاف قائم کرنے کے لئے میزان دیا تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ انہیں یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اس کے لئے طاقت استعمال کر سکتے ہیں۔ ﴿ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴾ (الحدید) یعنی ہم نے لوہا اتارا ہے' اس میں لوگوں کے لئے بڑی دھمکی ہے۔ اس میں جنگ کا سامان ہے اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ دیکھے کہ کون اللہ کے احکام و قوانین کے نفاذ کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ قوی اور عزیز ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنا اور اس کے لئے طاقت حاصل کرنا اللہ تعالیٰ کے پیغمبروں کا راستہ ہے۔ اسلام کے ماننے والوں کے لئے لازم ہے کہ وہ یہ راستہ اختیار کریں۔

مساوات اور عدل و انصاف کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ معاشرے میں قانون کو برتری حاصل ہو' تاکہ ہر شخص اس اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے سکے کہ قانون اس کی پشت پر ہے' اس لئے اس کے ساتھ کوئی ناانصافی یا اس کی حق تلفی نہ ہوگی۔ یہ بات اس طرح کہی جاتی ہے جیسے اس سے پہلے دنیا میں اس کا تصور ہی نہیں تھا۔ اسلام نے یہ بات بڑی وضاحت کے ساتھ کہی ہے کہ قانون کے سامنے سب برابر ہیں۔ اس کے مقابلہ میں کسی کو دم مارنے کی اجازت نہ ہوگی۔ مشہور واقعہ ہے جو صحیح بخاری اور حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہے کہ بنومخزوم کی ایک عورت نے چوری کی تو نبی ﷺ سے درخواست کی گئی کہ اس عورت نے چوری تو کی ہے لیکن شریف گھرانے کی ہے' اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے' کوئی اور سزا دے دی جائے۔ نبی ﷺ کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ آپؐ نے فرمایا کہ پچھلی قومیں اسی

طرح تباہ ہوئی ہیں کہ ان میں جو با اقتدار اور شریف سمجھے جاتے تھے انہوں نے اگر کوئی غلط کام کیا تو ان کو سزا نہیں دی گئی اور جو کمزور تھے ان کو سزا دی گئی۔ پھر اس کے بعد وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا جو شاید پیغمبر ہی کی زبان سے نکل سکتا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو آج میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔ ظاہر ہے کہ اس سے برتر تصور پیش نہیں کیا جا سکتا کہ قانون ہو تو سب کے لئے ہو۔ بڑے کے لئے بھی' چھوٹے کے لئے بھی' مرد کے لئے بھی' عورت کے لئے بھی۔ اس سے کوئی مستثنیٰ نہ قرار پائے۔ یہ اتنا صاف اور واضح تصور ہے کہ اس سے بہتر تصور دنیا میں کہیں نہیں ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انصاف کے لئے ضروری ہے کہ جرم عدالت سے ثابت ہو۔ اس کے بغیر سزا نہ دی جائے۔ یہ تصور بھی شاید اسلام ہی سے اخذ کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: وَاللّٰهِ لَا يُؤْسَرُ رَجُلٌ فِي الْإِسْلَامِ بِغَيْرِ عَدْوٍ ''قسم خدا کی! کسی شخص کو قید نہیں کیا جائے گا جب تک کہ عادل لوگ اس کے مجرم ہونے کی گواہی نہ دیں''۔

اسلام کے نزدیک یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ دیکھے کہ قانون کہیں مجروح تو نہیں ہو رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ((اَلْاِمَامُ رَاعٍ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ)) کہ امام تو چرواہا ہے' جس طرح ایک چرواہا بکریوں کے ریوڑ کا ذمہ دار ہوتا ہے اسی طرح امام بھی اپنی رعیت کا ذمہ دار ہے۔ اس کی حیثیت کسی بادشاہ کی نہیں بلکہ چرواہے کی ہے جو یہ دیکھتا رہتا ہے کہ کہیں کسی پر ظلم تو نہیں ہو رہا ہے۔ ریاست اس بات کی نگرانی کرتی رہے گی کہ کسی کا حق ضائع نہ ہونے پائے۔

ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ انسان کو اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کا حق ملنا چاہئے۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں بالکل واضح ہی نہیں بہت وسیع ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پوری زمین میں انسانوں کے فائدے کی چیزیں رکھی گئی ہیں۔ ﴿وَجَعَلْنَا فِيْهَا مَعَايِشَ﴾ یعنی زمین میں معاش کے ذرائع رکھ دیئے گئے ہیں۔ اسے حاصل کرنے کا ہر ایک کو حق ہے۔ ایک جگہ فرمایا: ﴿فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ﴾ کہ زمین کے ہر گوشے پر چلو پھرو' اس کے کنارے کنارے چلتے جاؤ اور اللہ نے جو رزق رکھا ہے اسے حاصل کرو۔ اسلام کے نزدیک حصولِ معاش میں کوئی ناجائز رکاوٹ قانوناً جرم ہے۔ اسلام انسان کو معاشی جدوجہد کی آزادی فراہم کرنے کے ساتھ اس بات کو بھی یقینی بناتا ہے کہ انسان کو اچھی غذا ملے۔ وہ گندی غذا اور گلی سڑی چیزیں کھانے پر مجبور نہ ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کا انسان پر یہ

احسان ہے کہ اسے طیبات دی گئی ہیں۔ انسان اس لئے نہیں ہے کہ وہ گندی اور ملاوٹ کی چیزیں کھائے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے طیب اور پاک صاف غذا ملنی چاہئے۔ یہ اس کا حق ہے۔ اس کے نزدیک لباس بھی انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام جب ننگے ہو گئے تو انہوں نے کہا اے اللہ میں ننگا ہو گیا ہوں۔ کچھ نہیں ملا تو درخت کے پتوں ہی سے خود کو چھپانے لگے۔ اسلام کی رُو سے انسان کی یہ فطری ضرورت بھی لازماً پوری ہونی چاہئے۔ اسی طرح اسے مکان ملنا چاہئے اور حسب سہولت اس کے پاس خادم بھی ہونا چاہئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کو ہم سرکاری خدمت پر لیں گے اگر اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو اس کو یہ حق ہے کہ بیت المال سے شادی کرے' اپنے لئے کپڑے کا انتظام کرے۔ وہ اپنے لئے مکان بھی بنا سکتا ہے اور سواری بھی رکھ سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کا حق اس کو نہیں ہو گا۔ علمائے کرام نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ریاست کی معاشی پوزیشن کیا ہے؟ بہرحال اسلامی ریاست یہ ذمہ داری لیتی ہے کہ کوئی شخص بھوکا پیاسا نہ رہے اور کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ اب میرا کوئی پوچھنے والا نہیں رہا۔ صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ((مَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهٖ)) یعنی کوئی شخص اس حال میں دنیا سے جا رہا ہے کہ اس نے مال چھوڑا ہے تو یہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔ ((وَمَنْ تَرَكَ عَيَالاً فَاِلَيَّ اَنَا وَلِيُّ مَنْ لَا وَلِيَّ لَهٗ)) آپؐ نے فرمایا کہ کوئی بال بچے چھوڑ کر جاتا ہے' مال چھوڑ کر نہیں جاتا ہے تو اس کا ولی میں ہوں گا اور اس کی نگہداشت میرے ذمے ہے۔ اس کے سلسلے میں علماء نے لکھا ہے کہ یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ کوئی فرد اور کوئی بچہ بھوکا نہ رہے' اس کی ضروریات پوری ہونے سے نہ رہ جائیں۔ خاندان میں اس کا کوئی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے تو ریاست اس کی ضرورت پوری کرنے کی ذمہ دار ہو گی۔ اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ انسان دنیا کو مقصود نہ بنائے۔

حقوق کے ذیل میں سماجی و معاشرتی حقوق کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اسے لازماً ملنے چاہئیں۔ سماجی اور معاشرتی حقوق کا تصور یہ ہے کہ آدمی سماج اور معاشرے میں فعال کردار (active part) ادا کر سکے۔ یہ اس کا حق ہے کہ اسے بے کار بنا کے نہ رکھ دیا جائے۔ اس پر ایسی پابندیاں نہ ہوں کہ وہ کچھ نہ کر سکے۔ اسلام میں اس کا تصور بالکل واضح ہے۔ اسلام فکر و عمل کی آزادی کا قائل ہے۔ جو لوگ غور و فکر نہیں کرتے ان کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ انہیں کیا ہو گیا ہے کہ جانوروں کی طرح بے سوچے سمجھے زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ دنیا کے آغاز و انجام پر غور کریں اور سمجھیں۔ عمل کی بھی وہ پوری آزادی دیتا ہے۔ صرف اس بات کی

پابندی ہے کہ انسان کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے جس سے فساد پھیلے اور معاشرہ کو نقصان پہنچے۔ پیغمبروں کی دعوت کی اوّلین بنیاد توحید ہوتی تھی' یعنی یہ کہ اللہ واحد کی عبادت کرو۔ اور پھر وہ کہتے تھے: ﴿لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا﴾ اللہ نے اپنے قانون کے ذریعے زمین میں اصلاح کی ہے' اس میں بگاڑ نہ پیدا کرو۔ اللہ نے اپنے قانون کو اصلاح کا ذریعہ بنایا ہے' اس کی موجودگی میں فساد برپا نہ کرو۔

اظہارِ خیال کی آزادی انسان کا ایک بنیادی حق ہے۔ اسلام نے اسے یہ حق عطا کیا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کے اس حق پر ناروا پابندی نہیں لگنی چاہئے۔ لیکن وہ اس بات کا اسے پابند بناتا ہے کہ اظہارِ خیال کے نام پر وہ بے حیائی نہ پھیلائے' کسی کی دل آزاری نہ کرے' کسی کا مذاق نہ اڑائے' کسی کی عزت و آبرو سے نہ کھیلے اور ملک و ریاست کو خطرے میں نہ ڈالے اور اس کے خلاف سازش نہ کرے۔ ان شرائط کے ساتھ اسے اظہارِ رائے کی آزادی ہے اور دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو اُس پر اِس نوعیت کی پابندی نہ لگاتا ہو۔ یہ اور بات ہے کہ آج بہت ساری چیزوں کا شمار بے حیائی میں نہیں ہے' اس کی اجازت دے دی گئی ہے۔

یہ بھی انسان کا ایک حق سمجھا جاتا ہے کہ اسے خاندان بسانے کی اجازت ہو۔ اس لئے کہ خاندان انسان کی ایک فطری ضرورت ہے۔ اس معاملے میں اسلام کی تعلیمات اتنی واضح ہیں کہ اس کی وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خاندان خدا کا عطیہ اور انعام ہے۔ آدمی کے بچوں اور پوتوں کا پھیلنا اس کے لئے زحمت نہیں بلکہ باعثِ رحمت ہے۔ خاندان کے سلسلہ میں اس سے بڑی بات اور کیا کہی جا سکتی ہے؟ پھر یہ کہ اس نے خاندان کا پورا سسٹم دیا ہے اور اسے باقی رکھنے کی تاکید کی ہے۔

تنہائی اور خلوت (privacy) کو بھی انسان کا ایک حق تسلیم کیا گیا ہے۔ قرآن نے نہ صرف یہ کہ یہ حق دیا ہے بلکہ اس کی تاکید کی ہے کہ کسی کی نجی زندگی میں مداخلت نہ کی جائے' یہاں تک کہ حکومت کو بھی اس میں مداخلت کا حق نہیں ہے۔

یہ بھی انسان کا ایک بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے اور اسلام میں یہ حق پہلے سے موجود ہے کہ انسان کو ملک و ملت کی خدمت کا اور تنقید اور اصلاحِ حال کا موقع ملنا چاہئے۔ اسلام نے انسان کو یہ حق فراہم کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو انسان ملک کی خدمت کرتا ہے وہ بہترین اور قابلِ قدر انسان ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قوی مؤمن ضعیف مؤمن سے بہتر ہے' اس لئے کہ طاقتور مؤمن انسانوں کی' سماج اور معاشرے کی خدمت کرے گا۔ جو کمزور ہے وہ کیا

خدمت کر سکے گا! ایک موقع پر آپؐ نے فرمایا کہ وہ مؤمن جو لوگوں سے ملتا جلتا ہے' ان کی تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے وہ بہتر ہے اس سے جو نہ کسی سے ملتا ہے اور نہ تکلیفیں برداشت کرتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ انسان کا حق ہے کہ وہ سوسائٹی کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرے۔ منافقوں سے کہا گیا کہ تمہاری سرگوشیاں تمہارے حق میں سودمند نہیں ہیں اس لئے کہ یہ ایک طرح کی سازشیں ہیں۔ ہاں اگر تم لوگوں کی اصلاح اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی بات کرو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا اور اللہ اجر عظیم سے نوازے گا۔ (النساء:۱۱۴)

ایک اور چیز جس کا آج بڑا چرچا ہے' وہ ہے دفاع۔ اس بات کو تو دنیا تسلیم کرتی ہے کہ ہر ایک کو دفاع کا حق ہے۔ کوئی شخص کسی کی جان لینا چاہے' کسی کی عزت و آبرو پر حملہ آور ہو یا کسی کا مال چھیننا چاہے' اس کی جائیداد پر قبضہ کرنا چاہے' اس کے گھر کو آگ لگانا اور اس کے بیوی بچوں پر حملہ کرنا چاہے' تو ظاہر ہے وہ خاموش نہیں بیٹھے گا' اس کا دفاع کرے گا۔ لیکن اس میں بے احتیاطی دو طرف سے ہوتی ہے۔ کبھی تو یہ ہوتا ہے دفاع کے نام پر آدمی ان باتوں کا خیال نہیں رکھتا جن کا خیال رکھنا چاہئے۔ اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ دہشت گردی اور تشدد کے نام پر آدمی کو دفاع کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اسلام میں دفاع کا بہت واضح تصور موجود ہے کہ دفاع کب ہونا چاہئے اور کیسے ہونا چاہئے' وہ کن حالات میں جائز ہے اور کس حد تک جائز ہے اور کہاں حدود سے تجاوز ہوتا ہے؟ یہ تمام چیزیں قرآن و حدیث میں موجود ہیں اور ہمارے علماء و فقہاء نے بھی بڑی تفصیل سے اس پر لکھا ہے۔ دفاع انسان کا بنیادی حق ہے' لیکن اگر دفاع کے نام پر ظلم ہو تو یہ غلط ہے۔ یہاں انفرادی دفاع کی بات ہے۔ ریاست اور ریاست کے درمیان جو مقابلہ ہوتا ہے اس کی یہاں بحث نہیں ہے۔

کسی جمہوری آئین کی ایک لازمی خصوصیت یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس میں اقلیتوں اور کمزور طبقات کے لئے تحفظ فراہم کیا جائے' انہیں دوسروں کے مساوی حقوق دیئے جائیں' ان کی حق تلفی نہ ہونے دی جائے اور انہیں ظلم و زیادتی سے بچانے کی تدبیر کی جائے۔

اسلام کے آنے سے پہلے کمزوروں کے حقوق عرب ہی میں نہیں دنیا میں کسی بھی جگہ محفوظ نہیں تھے۔ ان کا بری طرح استحصال ہو رہا تھا اور ان پر ظلم اور زیادتی آخری حد تک پہنچ چکی تھی۔ اسلام نے شروع ہی سے ان کے حق میں آواز اٹھائی اور اُن پر جو ظلم و زیادتی ہو رہی تھی اس پر سخت وعید سنائی اور دنیا و آخرت میں اس کے برے انجام سے خبردار کیا۔ اس نے خواتین' زیردستوں اور محکوموں' یتیموں' لاوارث بچوں' معذوروں' بوڑھوں اور ضعیفوں کے

حقوق صرف بیان ہی نہیں کیے بلکہ عملاً فراہم کیے اور معاشرہ کو ان کے ساتھ بہتر سے بہتر سلوک کی ترغیب دی اور ہمدردی اور تعاون کا جذبہ پیدا کیا۔

حقوق انسانی کے علم بردار مذہبی آزادی کو بھی انسان کا ایک حق قرار دیتے ہیں۔ اسلام نے بہت واضح الفاظ میں اس کا اعلان کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام لوگوں کو اپنے دین کا پابند بنا دیتا' کوئی اس سے بغاوت نہ کرتا۔ لیکن اللہ نے مذہب کے معاملہ میں انسان کو آزادی دی ہے اور اس کی یہ آزادی باقی رہنی چاہئے۔ اسی میں اس کا امتحان ہے۔ حضور ﷺ سے کہا گیا کہ آپ منکرین حق کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ یعنی آپ کی ذمہ داری نہیں ہے کہ لازماً انہیں راہِ راست پر لے آئیں' بلکہ یہ اللہ کا کام ہے' وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ یہ بھی بتایا کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ یعنی دین کے سلسلے میں کوئی جبر نہیں ہے' ہمارا کام یہ واضح کرنا تھا کہ ہدایت کیا ہے اور ضلالت کیا' وہ کر دیا گیا۔ اب یہ آدمی کا اختیار ہے۔ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے انکار کر دے۔ قرآن نے کہا کہ مذہب پر گفتگو بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ گفتگو تہذیب کے دائرے میں ہونی چاہئے۔ ہدایت ہے: وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ یعنی مذہب پر گفتگو ہو تو سلیقے اور تہذیب سے ہو۔ اس کے لئے غلط اور ناشائستہ انداز نہ اختیار کیا جائے۔ ہمارے علماء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی ریاست میں علی الاعلان یہ کہتا ہے کہ میں قرآن کو اللہ کی کتاب نہیں مانتا' محمد ﷺ کو اللہ کا رسول نہیں تسلیم کرتا تو بھی اسلامی حکومت اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گی۔ ہاں' اگر وہ بدزبانی پر اتر آئے تو اس کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔ رسول اللہ ﷺ کی شان میں یا حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام یا کسی بھی پیغمبر کی شان میں گستاخی ایک قابل تعزیر جرم ہے۔ اس کے ارتکاب پر اسلامی ریاست قتل کی سزا تک دے سکتی ہے۔ اسی طرح کسی بھی مذہب کے بانی یا اس کی محترم شخصیات کی توہین و تحقیر اور اس کے متعلق بدکلامی سزا کی مستحق ہوگی اور قانون کے مطابق اس پر سزا دی جائے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ جو حقوق کسی فرد یا طبقہ کو لازماً ملنے چاہئیں اسلام وہ تمام حقوق فراہم کرتا اور انسان کے فطری تقاضوں کی بہتر انداز میں تکمیل کرتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ دنیا ہی کی کامیابی کا نہیں' آخرت کی فوز و فلاح کا بھی ضامن ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے دونوں جہان کی کامیابی کے لئے کسی دستور اور ضابطۂ حیات کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

توضیح و تنقیح

سنت کی تشریعی حیثیت اور ''سزائے رجم''

تحریر: ڈاکٹر محمود الحسن عارف

فاضل مضمون نگار نے یہ مضمون کئی سال قبل روزنامہ نوائے وقت میں بالاقساط شائع ہونے والے ایک مضمون ''تراگنہ کہ نخیل بلند کا ہے گنہ'' کے جواب میں تحریر کیا تھا' جس میں ''سزائے رجم'' کے حدِ شرعی ہونے کے بارے میں جمہورِ اُمت کی رائے سے اختلاف کیا گیا تھا۔ پیشِ نظر مضمون میں اس ضمن میں دیئے گئے دلائل کی کمزوری کو واضح کیا گیا ہے اور نوائے وقت کے مضمون نگار کی طرف سے پیدا کئے جانے والے شکوک و شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے۔ (ادارہ)

کسی بھی مسلمان کے سامنے جب آنحضرت ﷺ کی کسی حدیث (قول یا فعل) کا ذکر آئے تو اس کے لئے سمع وطاعت کے سوا چارۂ کار نہیں رہتا' اسی لئے قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وما كان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضى الله ورسوله امرا ان يكون لهم الخيرة من امرهم ۗ ومن يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبينا﴾ (الاحزاب:۳۶)

''اور کسی مؤمن مرد وعورت کو یہ حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی امر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں' اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہ ہو گیا''۔

اس واضح قرآنی حکم کے مطابق چاہئے تو یہ تھا کہ جب ''رجم'' کی حمایت کے اثبات وحجیت میں آنحضرت ﷺ کی ''متواتر احادیث'' کا حوالہ دیا گیا تھا تو اس پر ''صاحب میزان'' اپنی سپر ڈال دیتے اور ''حدیث متواتر'' کے مقابلے میں محض قیاس و رائے کی دخل اندازی کر کے ''عذر گناہ بدتر از گناہ'' کا مصداق نہ ٹھہرتے' مگر ''صاحب میزان'' نے اس کے جواب میں متعدد قسطوں میں جواب لکھ کر بزعم خویش

بڑا تیر مارا ہے' اور اس سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نظر بد دُور اُن کی زبان و قلم خوب چلتی ہے۔ جب ''صاحب میزان'' یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ''آنحضرت ﷺ خدا کے محض نامہ بر نہیں تھے کہ اس کی کتاب پہنچا دینے کے بعد آپؐ کا کام ختم ہو گیا' رسول خدا کی حیثیت سے آپؐ کا ہر قول و فعل بجائے خود قانونی سند و حجت رکھتا ہے۔ آپؐ کو یہ مرتبہ کسی امام وفقیہہ نے نہیں دیا' خود قرآن نے آپؐ کا یہی مقام بیان کیا ہے۔ کوئی شخص جب تک صاف صاف قرآن کا انکار نہ کر دے' اس کے لئے سنت کی اس قانونی حیثیت کو چیلنج کرنا ممکن نہیں ہے۔ قرآن نے غیر مبہم الفاظ میں فرمایا ہے کہ زندگی کے ہر معاملے میں رسول کے امر و نہی کی ہر حال بے چون و چرا تعمیل کی جانی چاہئے'' تو ان سطور کے بعد اب بحث کی گنجائش کہاں رہ جاتی ہے! جب ہر معاملے میں پیغمبر ﷺ کی آئینی و تشریعی حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے تو اس کے بعد قیل و قال بجائے خود پیغمبرؐ کی مذکورہ بالا حیثیت کے انکار کرنے کے مترادف ہے' مگر یہی وہ کارنامہ ہے جو الغامدی صاحب نے اپنے مذکورہ مضمون کے ذریعے انجام دیا ہے اور اس پر بھی وہ مسلمانوں سے داد پانے کے خواہاں ہیں' چہ خوب؟

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد!

سنت کی تشریعی حیثیت

اگر ''صاحب میزان'' نے چاروں مسالک کے جلیل القدر ائمۂ کرام کو ''احادیث'' کے سامنے سرنگوں پایا اور یہ دیکھا ہے کہ جہاں کوئی مستند حدیث ملتی ہے وہاں تمام مکاتب کے فقہاء اُس کے سامنے سپر ڈال دیتے ہیں' تو اس پر انہیں تعجب نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ قرآن مجید کی دو صد سے زیادہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ساتھ اس کے رسول برحق کی اطاعت کا بھی ذکر آیا ہے اور ہر جگہ اطاعت و اتباع کا یہ ذکر غیر مشروط یا دوسرے الفاظ میں بغیر کسی قید و شرط کے بیان ہوا ہے۔ قرآن مجید کی کسی آیت سے کوئی بڑے سے بڑا ''منکر حدیث'' بھی یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی اطاعت و اتباع کو مشروط یا مقید ٹھہرایا ہو۔

صاحب میزان نے سورۂ یونس کی جس آیت کا سہارا لیا ہے' ہم آگے چل کر اس کو بھی واضح کریں گے' اور یہ ثابت کریں گے کہ انہوں نے اس کو سیاق وسباق سے ہٹ کر اور غلط ترجمے کے ساتھ استدلال میں پیش کیا ہے۔

قرآن مجید میں رسول ﷺ کی اطاعت واتباع پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ ''رسول کی اطاعت ہی کو خدا تعالیٰ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے''۔

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء: ۸۰)

اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع کو ہی خدا تعالیٰ کی محبت ومغفرت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ٹھہرایا گیا:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (آل عمران: ۳۱)

اور مؤمن ہونے کی یہ علامت بیان کی گئی:

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ (النساء: ٦٥)

''تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کرو اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں' بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں تب تک مؤمن نہیں ہوں گے''۔

ایک اور مقام پر حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کو دنیا بھر کے لوگوں کے لئے ''اُسوۂ حسنہ'' یعنی عمل کا قابل تقلید نمونہ قرار دیا گیا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾ (الاحزاب: ۲۱)

اگر آنحضرت ﷺ کا کوئی قول وفعل اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہوتا' جیسا کہ صاحب میزان نے دعویٰ کیا ہے' تو اللہ تعالیٰ کسی ایک مقام پر تو اپنے رسول کی اطاعت واتباع کو مشروط قرار دے دیتے۔

مذکورہ مضمون میں سورۃ الحشر کی جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے کہ:

﴿وَمَا اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ﴾ (الحشر:۷)

''پس جو چیز تم کو پیغمبر دے دیں وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں (اس سے) باز رہو''۔

اس میں بھی مثبت اور منفی دونوں جہتوں میں ''مَا'' کا لفظ مستعمل ہوا ہے۔ اور عربی زبان کا ادنیٰ طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ یہ مَا کلمہ ''حصر و جامعیت'' ہے' اور اس طرح رسول کے ہر مثبت حکم کی اطاعت کا اور ہر منفی حکم سے باز رہنے کا قرآنی حکم ملتا ہے۔ چنانچہ تمام مفسرین نے اس آیت سے یہی مفہوم اخذ کیا ہے' خود الغامدی صاحب کے استاد محترم مولانا اصلاحی صاحب' جو خود مسئلہ رجم کے اصل محرک ہیں' یہاں تسلیم کرتے ہیں:

> ''زندگی کے ہر معاملے میں رسول کے حکم و نہی کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے گی' اس لئے کہ رسول کی حیثیت جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے' اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کئے ہوئے ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے''۔ (تدبر قرآن' جلد ۸' صفحہ ۲۹۳)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

> ''اس سے معلوم ہوا کہ رسول کے دیئے ہوئے احکام بعینہٖ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں' ان کا ذکر قرآن مجید میں ہو یا نہ ہو' رسول کی طرف ان کی نسبت کی تحقیق ضروری ہے' لیکن نسبت ثابت ہے تو ان کا انکار خود اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار ہے' گفتہ او گفتہ اللہ بود''۔ (جلد ۸' صفحہ ۳۸۸)

علاوہ ازیں خود قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کی ذاتِ قدسی کو اپنا موضوعِ سخن بنا کر مخالفین کا منہ بند کر دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ پریشانِ خاطر ہوتے ہیں تو قرآن آپؐ کو تسلی دیتا ہے آپؐ وحی کے انتظار میں گھڑیاں گنتے ہیں اور بار بار سر آسمان کی طرف اٹھاتے ہیں تو قرآن اسی کو اپنا موضوع ٹھہراتا ہے۔ آپ ﷺ کے ابتدائی حالات کی محنت و مشقت ہو یا زندگی کے اختتامی دور کی فتح و کامرانی' قرآن نے دونوں کو اپنے سینہ اطہر میں ''بَیْنَ الدُّفَّتَیْن'' جگہ دی۔ پیغمبر ﷺ لڑنے کے لئے نکلتے ہیں اور جنگ بدر میں فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوتے ہیں تو بادشاہِ ارض و سما اس پر پوری

پوری سورتیں نازل کرتا ہے۔ پیغمبر ﷺ کو جنگ میں چوٹ لگتی ہے تو قرآن اپنی آیات کو اس کے لئے وقف کر دیتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس' پیغمبر ﷺ میدانِ بدر میں ریت یا کنکریاں پھینکتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس عمل کو اپنا عمل قرار دیتا ہے' پیغمبر ﷺ صلح حدیبیہ کے موقع پر مجاہدین صف شکن سے موت پر بیعت لیتا ہے تو خدا پیغمبرؐ کے ہاتھوں پر بیعت کرنے والوں کو اپنے ہاتھ پر بیعت کرنے کی خوشخبری اور اس بیعت کو بیعت رضوان بنانے کی بشارت سناتا ہے۔ ایک بدو قبیلہ پیغمبر ﷺ کو ان کے حجرے کے باہر سے سخت آواز میں بلاتا ہے تو قرآن ان کو ''حبط اعمال'' کی دھمکی دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس بارگاہِ ناز میں انہیں ادب واحترام سے آنا اور پیغمبر ﷺ کو آہستگی سے پکارنا چاہئے' ورنہ تمہارے سب اعمال اکارت ہو جائیں گے۔ پیغمبر ﷺ کی بعض ازواج مطہرات سے پیغمبر ﷺ کو شکایت ہوتی ہے تو قرآن خدا' جبرئیل' فرشتوں اور تمام اہل ایمان کو آپؐ کی تائید وحمایت میں لا کھڑا کرتا ہے۔ یہ سلسلہ مکہ میں نبوت ملنے سے شروع ہوا اور ''حجۃ الوداع'' کے تکمیل دین کے موقع تک یکساں طریقے سے جاری و ساری رہا۔ افسوس کا مقام ہے کہ ''صاحب میزان'' نے قرآن مجید سے قرآن مجید کو سمجھنے کا تو دعویٰ کیا' مگر انہوں نے قرآن سے حامل قرآن اور مہبط وحی ﷺ کا مقام و مرتبہ نہیں پہچانا۔ قرآن مجید سے آنحضرت ﷺ کا جو مقام و مرتبہ متعین ہوتا ہے وہ بقول شاعر مشرق علامہ اقبال یہ ہے ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

مذکورہ مضمون میں صاحبِ میزان کا مرکزی خیال یہ ہے کہ:

(الف: کسی بھی درجے کی (واحد' عزیز' مشہور اور متواتر) حدیث سے قرآن مجید کی کسی آیت کو یا اس کے کسی حکم کو نہ منسوخ کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے عام حکم کو خاص اور خاص حکم کو عام کرنا ممکن ہے۔

ب: واحد حق جو قرآن مجید نے ''سنۃ'' کو دیا ہے وہ اس کی ''تبیین و بیان'' کا

ہے' لیکن یہ ''تبیین و بیان'' بھی لغت و اشتقاق کے ماتحت ہونا چاہئے' اس کے علاوہ اگر ہوگا تو قابل قبول نہ ہوگا' وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک کسی حدیث سے قرآن مجید کی کسی آیت کے منسوخ ہونے کا تعلق ہے' تو اگرچہ فقہائے متقدمین اس کے حق میں تھے' لیکن عصر حاضر کے بہت سے نامور محققین نے یہ صراحت کی ہے کہ اس سے ان کی مراد درحقیقت قرآنی احکام کی ''تعمیم و تخصیص'' ہے۔ بنا بریں اب یہی ایک مسئلہ زیر بحث رہ جاتا ہے کہ آیا ''احادیث رسولؐ'' کو قرآن مجید کی آیات میں تعمیم و تخصیص کا حق حاصل ہے' یا نہیں؟ جمہور صحابہؓ جمہور تابعین و تبع تابعین' جملہ اہل مسالک (شافعی' حنفی' مالکی' حنبلی' اہل ظواہر اور اہل تشیع) ائمہ اربعہ' جملہ مفسرین' جملہ فقہاء و اعیان ملت قرآن و سنت کی واضح نصوص کی روشنی میں احادیث نبویہ کے لئے قرآنی احکام میں اس قسم کی تخصیص و تعمیم کا حق تسلیم کرتے ہیں' صرف چند خوارج' ایک معتزلی عالم ابومسلم اصفہانی اور دورِ حاضر کے ''اہل قرآن'' جن میں ''صاحب میزان'' نمایاں ہیں' اس کے مخالف ہیں۔ اب اصولی طور پر تو یہیں پر بات ختم ہو جاتی ہے' اس لئے کہ جس مسئلے پر چودہ صدیوں کے اہل اجتہاد و بصیرت کا اجماع ہو چکا ہو' اور اتنی کثیر تعداد میں اُمت کے فقہاء' صلحاء' علماء اور محققین اس پر صاد کر چکے ہوں' تو یہ بجائے خود اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ یہی قرآن و حدیث کا منشا ہے' علاوہ ازیں اُمت کا یہ اجماع ''سبیل المؤمنین'' کا مصداق بھی ہے' جس کی مخالفت سے قرآن نے سختی سے منع کیا' اور عدمِ اتفاق کی صورت میں سزائے جہنم کی وعید سنائی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا﴾ (النساء:۱۱۵)

''اور جو شخص سیدھا راستہ معلوم ہونے کے بعد پیغمبر ﷺ کی مخالفت کرے اور مؤمنوں کے رستے کے سوا اور رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے ہم اسے اُدھر ہی چلنے دیں گے اور قیامت کے دن جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے''۔

تاہم چونکہ ''صاحب میزان'' نے بعض کمزور دلائل کے سہارے جمہور اُمت کے مسلک پر اعتراض کیا ہے' اس لئے جمہور اُمت کے دلائل کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

(۱) قرآن مجید کی متعدد آیات میں آنحضرت ﷺ کی اطاعت مطلقہ کا ذکر آیا ہے اور کسی ایک مقام میں بھی آپ کی اطاعت واتباع کے لئے کسی قسم کی قید یا شرط کا کسی اشارے کنائے میں بھی ذکر نہیں کیا گیا۔ اس طرح قرآن آنحضرت ﷺ کے ''مطاعِ مطلق'' ہونے کا اس وقت تک تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جب تک آپؐ سے ہر ثابت شدہ ارشاد پر آنکھیں بند کر کے عمل نہ کیا جائے۔

(۲) قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء: ۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی''۔

گویا قرآن مجید کی نظروں میں ''اطاعت خدا اور اطاعت رسول'' میں صرف نام کا فرق ہے' ورنہ دونوں کا منبع ومصدر ایک ہی ہے۔ خود قرآن کریم میں تصریح ہے کہ:

﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۞ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۞ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۞﴾ (النجم: ۲۔۴)

''تمہارے رفیق (محمد ﷺ) نہ رستہ بھولے' نہ بھٹکے ہیں' اور نہ خواہش نفس سے مُنہ سے بات نکالتے ہیں' یہ تو حکم خدا ہے جو اُن کی طرف بھیجا جاتا ہے''۔

اس آیت کی تفسیر میں جملہ مفسرین نے صراحت کی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی کوئی عام بات بھی عام نہیں ہے' آپؐ کی ہر بات میں وحیٔ ربانی کا پرتو ہوتا ہے۔

''صاحب میزان'' کے استاد محترم کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا:

''نبی چونکہ معصوم اور اس کا ہر قول وفعل لوگوں کے لئے نمونہ ہوتا ہے' اس وجہ سے عام زندگی میں بھی اس کی کوئی بات حق وعدل سے ہٹی ہوئی نہیں ہوتی اور اگر کبھی اس سے فروگزاشت صادر ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح فرما دیتا ہے''۔ (تدبر قرآن' جلد ۸' ص ۵۳)

اور ہر شخص جانتا ہے کہ ہر متکلم کو اپنی بات کی ''تعمیم و تخصیص'' کا حق حاصل ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصب رسالت عظمیٰ پر فائز تھے' اور آپؐ پر وحی کا نزول ''جلی و خفی'' دونوں طرح سے ہوتا تھا' لہٰذا جب آپؐ نے قرآن مجید کے کسی حکم کو عام یا خاص فرمایا تو اس کے لئے لازمی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آپؐ کو اس تخصیص و تعمیم سے ''پادشاہِ ارض و سما'' اور ''مالک کون و مکاں'' نے مطلع کیا ہوگا' بصورتِ دیگر یہ بذاتِ خود محولہ بالا قرآنی آیت کی العیاذ باللہ تکذیب ہوگی کہ آپؐ نے خود اپنی مرضی سے حکم خدا کو بدل ڈالا۔ امام غزالی اس مضمون کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ اس صورت میں ناسخ (مراد تعمیم و تخصیص کرنے والا) خود اللہ تعالیٰ ہے' جس نے اپنے رسول کی زبان سے یہ کہلوایا۔ اور خلاصہ یہ کہ یہ شرط نہیں ہے کہ قرآن مجید کا ناسخ (تعمیم و تخصیص) قرآن ہی کے کسی حکم سے ہو' بلکہ یہ کام آنحضرت ﷺ پر ایسی وحی نازل کر کے بھی لیا جا سکتا ہے جو قرآن میں مذکور نہیں' فرق صرف عبارت کا ہے۔ پس خدا کا کلام کبھی تو منظوم شکل میں نازل ہوتا ہے تو اسے قرآن کہا جاتا ہے' اور کبھی خدا کا یہ حکم حرف و عبارت کے بغیر نزول کرتا ہے تو اسے سنت کہہ دیا جاتا ہے' اور یہ تمام کلام (قرآن و سنت) آنحضرت ﷺ سے ہی سنا جاتا ہے۔ بہر حال ناسخ ہر صورت میں ایک ہی یعنی اللہ تعالیٰ ہے''۔ (المستصفیٰ' ج ۲۰' ص ۱۲۵)

علامہ شاطبی الموافقات میں فرماتے ہیں:

> ''اور تیرے لئے یہ بات کافی ہے کہ سنت قرآن کے مطلق کو مقید اور عام کو خاص اور غیر ظاہر کو ظاہر کرتی ہے' جیسا کہ اصول کی کتابوں میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر سارق پر حد لگائی جائے' لیکن سنت سے سرقہ کے نصاب کی تخصیص ہوئی۔ قرآن مجید سے ہر قسم کے (تھوڑے اور زیادہ) مال پر زکوٰۃ کا حکم مستنبط ہوتا ہے' مگر سنت سے پتہ چلا کہ مخصوص قسم کے مال اور صاحب نصاب پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ''اس کے علاوہ تمام عورتیں تمہارے لئے حلال ہیں'' مگر احادیث سے عورت کے ساتھ اس کی

پھوپھی اور خالہ کو جمع کرنے کی حرمت بھی معلوم ہوتی ہے''۔

(الموافقات: ج ۴' ص ۴)

(۳) قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کو ''قرآن مجید'' کی تبیین کا حق خود عطا کیا ہے' جیسا کہ خود الغامدی صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے آنحضرت ﷺ کو ''تبیین و بیان'' کا یہ حق بغیر کسی قید و شرط کے عطا کیا ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ یہ ''تبیین و بیان'' اس آیت کے ظاہری مفہوم کے عین مطابق ہو یا اس سے مختلف' تو اس میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اگر یہ ''تبیین و بیان'' اس کے ظاہری مفہوم کے عین مطابق ہی ہو اور اس سے رتی برابر بھی مختلف نہ ہو تو اس میں آنحضرت ﷺ کی کیا خصوصیت ہے؟ اس قسم کی توضیح و تشریح تو صدہا مفسرین کرتے آئے ہیں' اور یہ ضروری نہیں کہ ان تمام کی یہ توضیحات درست بھی ہوں۔ اندریں صورت معاذ اللہ قرآن مجید کی توضیح و تشریح کے سلسلے میں مہبط وحی ﷺ اور ایک عام مفسر میں (خواہ وہ ''صاحب میزان'' ہی ہوں) کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟ علاوہ ازیں قرآن مجید کی تشریح کے ضمن میں اگر ایک عام اُمتی اور پیغمبر اسلام دونوں کے حقوق برابر ہیں تو پھر قرآن کی مذکورہ بالا صراحت کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟ اسی بنا پر جملہ مفسرین' علماء و فقہاء نے نصوصِ قرآن کی روشنی میں آنحضرت ﷺ کا یہ حق تسلیم کیا ہے کہ آپؐ قرآن مجید کی آیات میں تخصیص و تعمیم اور قید و اطلاق کا غیر مشروط حق رکھتے ہیں۔ علامہ شاطبی' جن کا نامکمل حوالہ الغامدی صاحب نے پیش کیا ہے' فرماتے ہیں:

> ''پس سنت تو بمنزلہ تفسیر اور شرح کے ہے' اور قرآن مجید کی آیت ﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ﴾ اس پر دلالت کرتی ہے۔ سنت کے قرآن پر قاضی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ قرآن کی مبین و شارح ہے۔ سنت اپنے مفہوم میں قرآن مجید کی طرف راجع ہے' پس وہ اس کے مجمل کی تفصیل' اس کے مشکل کا بیان اور اس کے مختصر کی شرح ہے..... احادیث نبویہ دو باتوں میں سے ایک کا احتمال رکھتی ہیں: یا تو یہ کہ وہ قرآن کا بیان ہیں' یعنی یہ کہ اس کی بیان کردہ صورت دو احتمالوں میں سے ایک ہوگی' جب مکلف نے حدیث پر عمل کیا تو قرآن مجید پر بھی عمل ہو گیا

اور سنت رسول پر بھی' اور اگر اس نے حدیث کے بیان پر عمل نہ کیا تو نہ قرآن پر عمل ہوگا اور نہ حدیث پر''۔ (الموافقات' ج ۴' ص ۵ تا ۸)

امام شافعی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''کتاب الام'' میں لکھتے ہیں:

''اور آنحضرت ﷺ کی سنت اللہ تعالیٰ کی منشا و ارادے کی وضاحت کرتی ہے' اور یہ سنت قرآن کے عام کو خاص اور خاص کو عام کرتی ہے''۔

عصر حاضر کے ایک نامور مصری محقق محمد ابوزہرہ لکھتے ہیں:

''احادیث سے قرآن مجید کی تخصیص کا یہ مفہوم نہیں کہ اس کے بعض احکام کو اس کے عموم سے نکال دیا جاتا ہے' بلکہ تخصیص کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے ذریعے شارع کا ارادہ اور منشا ظاہر کیا جاتا ہے کہ فلاں حکم اس میں سرے سے شامل ہی نہ تھا''۔ (اصول الفقہ' ص ۱۶۵)

عصر حاضر کے انہی محقق نے ''مقام السنة من الكتاب'' (قرآن مجید کے مقابلے میں سنت کا مقام) کے عنوان سے سنت کے لئے حسب ذیل حقوق کا اثبات کیا ہے:

(الف) وہ قرآن مجید کے مبہم کو بیان کرتی ہے' اس کے مجمل کی تفصیل کرتی اور اس کے عام کو خاص اور خاص کو عام کرتی ہے۔

(ب) قرآن مجید کے بیان کردہ اصولوں پر فرائض و احکام کا اضافہ کرتی ہے' بایں طور کہ ان فرائض و احکام سے قرآن مجید کے بیان کردہ اصولوں کی تکمیل ہوتی ہے۔

(ج) ایسے احکام بیان کرتی ہے جن کا ذکر قرآن مجید میں سرے سے موجود ہی نہیں' مثلاً گدھوں کی حرمت' درندوں کی تحریم اور دیات وغیرہ کا ذکر۔

''صاحب میزان'' کی یہ انتہائی کوتاہ نظری ہے کہ وہ قرآن مجید سے ثابت شدہ ''تخصیص و تعمیم'' کا حق پیغمبر اسلام کے لئے تسلیم نہیں کرتے' حالانکہ بعض مقامات پر ''تخصیص و تعمیم'' کا یہ حق عام مفسرین نے بھی استعمال کیا ہے۔ بقول علامہ الفراتی: تخصصات پندرہ اقسام کے ہیں' ان میں سے بعض محض عقلی ہیں' ان کے افہام و تفہیم کے لئے کسی نص کی بھی ضرورت نہیں' مثال کے طور پر قرآن مجید میں ہے: ﴿اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ﴾ اس آیت میں ''النّاس'' کلمہ حصر و جامعیت ہے' مگر اس سے مراد

صرف ''کفارِ مکہ'' ہیں۔

''صاحب میزان'' کو شاید علم ہوگا کہ اس قسم کی تخصیص و تعمیم کا حق ان کے فاضل استاد و مولانا اصلاحی صاحب نے بھی استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں ''شیطان'' کا لفظ بطورِ اسم علم کے ہر جگہ آیا ہے اور اس سے تمام اُمت نے مخصوص شیطان مراد لیا ہے' جس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا' مگر ان کے استاد محترم ''مُصر'' ہیں کہ شیطان کسی خاص فرد کا نام نہیں' بلکہ یہ تسلسل سے جاری رہنے والا برائی کا ایک مخصوص طبقہ ہے (تفسیر سورۃ الناس)۔ اس طرح انہوں نے محض اپنی عقل سے قرآن کے خاص کو عام کیا۔ تفسیر ''تدبر قرآن'' میں اس قسم کی مثالیں وافر مل جاتی ہیں۔ تو گویا: ع ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند۔

(۵) ''صاحب میزان'' نے بطورِ اصول کے جو آنحضرت ﷺ کے لئے قرآن مجید کی ''تبیین'' کا مشروط حق تسلیم کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ پیغمبر اس کے احکام میں کسی ترمیم و اضافہ کا مجاز نہیں ہے' تو ان کے اس دعوے کی عملی تعبیر دین کی نصف عمارت منہدم کرنے کا موجب ہو سکتی ہے۔ ان کو علم ہوگا کہ قرآن مجید میں نماز پڑھنے کا حکم لفظ ''صلوٰۃ'' کے ساتھ دیا گیا ہے' مگر کسی جگہ قرآن مجید میں نماز کا طریقہ' اس کے فرائض اور اس کے اوقاتِ خمسہ کی تشریح نہیں ہے۔ کیا احادیثِ نبویہ سے اس قسم کا استفادہ بھی قرآن پر ''اضافہ اور زیادت'' نہیں ہے؟ اندریں صورت آپ قرآن مجید سے یا اپنے مرغوبِ خاطر جاہلی اشعار سے اس بنیادی مسئلے کا کیا حل تجویز کر سکتے ہیں؟

علیٰ ہذا القیاس ''زکوٰۃ'' کے معنی پاکیزگی اور طہارت کے ہیں' تو کیا احادیث نبویہؐ کی بیان کردہ صورت' اس کے نصاب' اس کی فرضیت اور اس کی مقدار وغیرہ کا بیان بقول آپ کے قرآن مجید پر اضافہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر آپ کو کہا جائے کہ اس تمام تفصیل کو ''نص قرآن'' سے ثابت کر کے دکھائیں تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟ قرآن مجید کے بیان کردہ دیگر احکام' مثلاً حج اور صومِ رمضان وغیرہ کو بھی اسی پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔

(۶) ''صاحب میزان'' نے اپنے موقف کے حق میں جو کمزور اور منطقی استدلالات پیش کئے ہیں ان کا بطلان کسی بھی صاحب فکر ونظر پر مخفی نہیں۔ اس پر بھی انہیں اصرار ہے کہ ''جمہور اُمّت'' ان کو قرآن مجید سے اس کا کوئی ثبوت پیش کریں' حالانکہ جمہور اُمت کا موقف ومسلک تو صدہا آیاتِ بینات پر مشتمل ہے اور خدا تعالیٰ نے جس شخص کو دیکھنے اور مطالعہ کرنے کے لئے دو آنکھیں' سوچنے کے لئے قلب سلیم اور فیصلہ کرنے کے لئے میزان نہیں' بلکہ ''القسطاس المستقیم'' عطا کی ہے وہ روز روشن کی طرح جمہور اُمت کے مسلک کی تائید وتوثیق کرے گا۔ ''صاحب میزان'' کو معلوم ہونا چاہئے کہ جمہور اُمت کے پاس دلیل موجود ہے' دلیل پیش کرنے کی ضرورت تو آپ کو ہے۔ کیا آپ قرآن مجید کی کوئی ایسی آیت پیش کر سکتے ہیں جس میں آنحضرت ﷺ کے حقوق واختیارات کو پابند سلاسل کیا گیا ہو؟

اس مقام پر صاحب میزان نے قرآن مجید کی جو واحد آیت اپنے استدلال میں پیش کی ہے' مقام افسوس ہے کہ صاحب میزان نے اس کا ترجمہ بھی درست طور پر نہیں لکھا۔ انہوں نے ''اَنْ اُبَدِّلَهٗ'' کا ترجمہ ''کوئی ترمیم واضافہ نہیں کرسکتا ہے'' سے کیا ہے' جو بالکل غلط ترجمہ ہے۔ عربی زبان کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ ''اَنْ اُبَدِّلَهٗ'' کا لفظ ''بَدَّلَ تَبْدِیْلًا'' سے ہے' جس کے معنی ''ترمیم واضافہ'' کے نہیں' بلکہ اس کو مکمل تبدیل کر دینے اور بدل دینے کے ہیں۔ اس طرح کے غلط سلط ترجموں سے اپنے موقف کا اثبات انتہائی افسوسناک ہے۔

اصلی صورتِ حال یہ ہے کہ یہ آیت قرآن مجید میں ''ترمیم واضافہ'' کی تردید کے لئے سرے سے استدلال کا کوئی پہلو نہیں رکھتی' اس میں قرآن کی جگہ کسی اور قرآن کی تبدیلی کی تردید کا ذکر ہے۔ پوری آیت کا ترجمہ اگر سامنے رکھا جائے تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے:

﴿وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا

مَا یُوْحٰی اِلَیَّ ۚ (یونس:۱۵)

''اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں' تو جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں وہ کہتے ہیں کہ یا تو اس کے سوا کوئی اور قرآن بنالاؤ یا اس کو بدل دو۔ کہہ دو کہ مجھ کو اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں' میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے''۔

اور ہر مبتدی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ قرآن مجید کو بدل دینے اور اس کے عام کو خاص یا خاص کو عام کرنے میں بڑا فرق ہے۔ امام غزالی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

''کفارِ مکہ نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اس قرآن کی طرح کا کوئی اور قرآن بنالاؤ' تو آنحضرت ﷺ کو یہ جواب سکھایا گیا کہ میں اپنی طرف سے تبدیلی کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ انہوں نے اس مقام پر کسی ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم طلب نہیں کیا تھا' پس اس آیت کا زیر بحث صورت سے کوئی تعلق نہیں''۔ (المستصفیٰ' ج۱' ص۱۲۵)

اب اس پس منظر میں رجم کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں بلاشبہ بدکار مَرد و عورت کی سزا سو دُرّے بیان ہوئی ہے' مگر احادیث متواترہ سے یہ ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس مقام پر ''اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ'' کی تخصیص فرماتے ہوئے صرف غیر شادی شدہ مَرد و زن کو اس کا مصداق ٹھہرایا۔ رہ گئے شادی شدہ مَرد و زن' تو ان کے لئے آپؐ نے رجم کی سزا تجویز فرمائی۔ آنحضرت ﷺ کا یہ بیان نہ تو قرآن سے متصادم ہے اور نہ قرآن پر کوئی اضافہ ہے۔ اس طرح کی بے شمار صورتیں ہمیں قرآن و سنت سے معلوم ہوتی ہیں۔ ان میں سے اگر کسی ایک کا انکار کر دیا جائے تو دین کی نصف عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ بنا بریں شادی شدہ مَرد و زن کے لئے سزائے رجم کا اثبات حسب ذیل قوی دلائل سے ہوتا ہے:

(الف) احادیث متواترہ: جن کو کم و بیش ۳۵ صحابہ رضی اللہ عنہم نے روایت کیا۔

(ب) اجماعِ اُمت: اجماعِ صحابہ' اجماعِ تابعین و تبع تابعین اور اجماعِ اہل مسالک خمسہ۔

ان میں سے ہر دلیل اپنی جگہ قوی دلیل ہے۔ اس حکم پر آنحضرت ﷺ نے عمل

کیا' حضور ﷺ کے خلفاء نے عمل کیا اور صدہا سال تک مسلمانوں نے اس پر عمل کیا' آج تک کسی بھی صاحب اجتہاد و بصیرت شخص نے اس کا انکار نہیں کیا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ رجم کی بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

''یہ امر کہ زنا بعد احصان کی سزا کیا ہے' قرآن مجید نے نہیں بتایا' بلکہ اس کا علم ہمیں حدیث سے ہوتا ہے۔ بکثرت معتبر روایات سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے نہ صرف قولاً اس کی سزا رجم (سنگساری) بیان فرمائی ہے' بلکہ عملاً آپؐ نے متعدد مقدمات میں یہی سزا نافذ کی ہے۔ پھر آپؐ کے بعد چاروں خلفائے راشدین نے اپنے اپنے دور میں یہی سزا نافذ کی اور اسی کے قانونی سزا ہونے کا بار بار اعلان کیا۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین میں یہ مسئلہ بالکل متفق علیہ تھا' کسی ایک شخص کا بھی کوئی ایسا قول موجود نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ قرنِ اوّل میں کسی کو اس کے ایک ثابت شدہ حکم شرعی ہونے میں کوئی شک تھا' اُمت کی پوری تاریخ میں بغیر خوارج اور بعض معتزلہ کے کسی نے بھی اس سے انکار نہیں کیا۔'' (تفہیم القرآن' ج ۳' ص ۳۲۷)

اور اس پر بھی انہیں اصرار ہے کہ انہیں ''معتزلی'' نہ کہا جائے۔ oo

صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن و بانی تنظیم اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

کے پانچ خطبات جو سالانہ محاضرات ۱۹۹۱ء میں دیئے گئے

حقیقت ایمان

تسوید و ترتیب: مولانا ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

﴿اہم موضوعات﴾

■ ایمان کا لغوی اور اصطلاحی مفہوم ■ ایمان کا موضوع
■ قانونی اور حقیقی ایمان کا فرق اور ان کے ضمن میں کلامی مباحث
■ ایمان و عمل کا باہمی تعلق ■ ایمان اور نفاق ■ ایمان حقیقی کے سرچشمے

اشاعت خاص: 90 روپے اشاعت عام: 50 روپے

خوشخبری!

شعبہ تحقیق اسلامی (IRTS) کی اعزازی ممبر شپ!

قرآن اکیڈمی میں شعبہ تحقیق اسلامی (IRTS) کے دفاتر کے قیام اور انتظام کا ابتدائی مرحلہ بحمداللہ مکمل ہو چکا ہے۔ شعبہ میں مختلف موضوعات پر تحقیق وتصنیف کے لئے بعض ریسرچ ایسوسی ایٹس کی خدمات بھی حاصل کر لی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں انجمن خدام القرآن کے متعلقین کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اگر تحقیق وتصنیف کے کام سے دلچسپی رکھتے ہوں اور کم سے کم ایم اے تک تعلیم یافتہ ہوں (ترجیحاً وہ افراد جو ایم فل یا پی ایچ ڈی کے پراجیکٹ پر کام جاری رکھے ہوئے ہوں یا کرنا چاہتے ہوں) تو وہ شعبہ ہٰذا میں بطور اعزازی ریسرچ ایسوسی ایٹ ممبر شپ حاصل کر سکتے ہیں۔ ممبر شپ حاصل کرنے کی صورت میں انہیں شعبہ میں مندرجہ ذیل سہولیات میسر ہوں گی:

1) صبح 8 بجے سے رات 8 بجے تک ریسرچ ڈیسک کی سہولت۔
2) کمپیوٹر وانٹرنیٹ اور پرنٹنگ کی سہولت۔
3) لائبریری میں کثیر تعداد میں پائی جانے والی کتب وجرائد تک رسائی۔
4) Bibliographies اور Indices تک رسائی۔
5) مختلف موضوعات کے ضمن میں Resource Persons سے رہنمائی کی سہولت۔
6) تحقیقی مضامین کو ریسرچ میگزینز میں شائع کروانے کی سہولت۔
7) ریسرچ سکالرشپ کے حصول میں معاونت۔

اعزازی ممبر شپ حاصل کرنے کے خواہش مند حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ایک سادہ کاغذ پر اپنے مکمل کوائف تحریر فرمائیں اور جس موضوع پر تحقیق وتصنیف کا کام کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں اس کا مختصر تعارف بھی تحریر فرمائیں۔ درخواستوں کی پڑتال کے بعد درخواست دہندگان کو انٹرویو کے لئے پیش ہونا ہوگا جس کی تاریخ اور وقت کی اطلاع بذریعہ خط ارسال کی جائے گی۔ درخواستیں 15 مارچ 2005ء تک مندرجہ ذیل پتے پر ارسال کی جائیں۔ مزید معلومات اور خط وکتابت کیلئے:

حافظ عاطف وحید' انچارج شعبہ تحقیق اسلامی'
قرآن اکیڈمی' 36/K ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون: 03-5869501' ای میل: irts@tanzeem.org